© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

روزنامہ "ٹائمز آف کراچی" نے اپنا ایک مطبوعہ اداریہ (مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۴ء) "ترجمان" میں اشاعت اور تبصرے کے لیے بھیجا تھا۔ اس اداریے پر ہمارا مفصل تبصرہ "تسنیم" میں شائع ہو چکا ہے۔ روزنامہ مذکور کے مدیر شہیر نے، نیز محکمہ تعلقاتِ عامہ پنجاب نے اس اداریے کی پریس میں وسیع پیمانے پر اشاعت کی کوشش کی ہے۔ ہم اس اداریے پر اپنے جوابی تبصرے کو "ترجمان" میں بھی نقل کر رہے ہیں تاکہ ہمارے نقطۂ نظر سے امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ لوگ آگاہ ہو جائیں۔ ہم پہلے ٹائمز آف کراچی کے اداریے کا وہ "مستند" ترجمہ دیں گے جسے محکمہ تعلقاتِ عامہ نے اخبارات کو مہیا کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ بعد میں اپنا تبصرہ نقل کیا جائے گا۔

ٹائمز آف کراچی کا اداریہ

(اسلام کے نام پر)

اخوان المسلمون اور اس کے قائد جناب حسن الھضیبی جنھیں عمر قید کی سزا دی گئی ہے، کا المناک انجام غایت درجہ افسوسناک اور غم انگیز واقعہ ہے۔ لیکن اس سانحہ کا پس منظر پوری طرح سمجھنے میں حزم و احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ یہ مسئلہ ایسے اخلاقی اصول کا مظہر ہے جسے عالم اسلام میں ہمہ گیر وسعت حاصل ہے۔

جب مغربی حاکمیت و تفوق میں ایک مدت کی گیرائی کے بعد تنزل پیدا ہونا شروع ہو گیا تو اسلامی تصورات کا از سرِ نو جنم لینا ایک فطری بات تھی۔ الاخوان المسلمون کا وجود اس نشاۃ ثانیہ کے مظاہرات کا ایک بین ثبوت تھا جس کی بنا پر اس جماعت کا قومی بیداری کی تحریک سے گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔ غیر ملکی حکومت دو لحاظ سے اسلام کے منافی تھی۔ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس معنی میں کہ اس نے اسلامی اسلوبِ فکر پر ایک غیر ملکی تمدن ٹھونسنے میں عامۃ المسلمین کے جذبات کو کچلنے کی سعی کی، چنانچہ اس قسم کی تحریکوں نے ایران، انڈونیشیا اور دیگر ملکوں میں سر اٹھانا شروع کر دیا اور غیر ملکی اثر سے مخلصی پانے کے سلسلہ میں جنگ کے بعد عام سیاسی بیداری نے جو صورت اختیار کی اس کا خوشگوار ترین ثبوت پاکستان کے منصۂ شہود پر آنے سے ملتا ہے۔ جہاں تک برطانیہ سے مخالفت کا تعلق ہے پاکستان کے قیام سے نہ صرف قومیت کی تمنائیں اجاگر ہوگئی تھیں بلکہ اس کا وجود اسلام سے گہری شیفتگی کا مظہر بھی بن گیا تھا اور اس لحاظ سے مسلمانوں میں سیاسی بیداری ہندوؤں کے مطالبہ آزادی سے جداگانہ حیثیت کی حامل تھی۔ اس قسم کی تحریکات غیر ملکی طاقتوں کے خلاف ایک بھرپور قوت پر مشتمل تھیں لیکن غیر ملکی اقتدار کے اٹھ جانے کے بعد ان تحریکوں نے انتہائی اہمیت کے معاشرتی معاملات کو بھی اپنے حیطۂ اختیار میں لے لیا۔ شاہ فاروق کی تخت برداری پر، جو بدعنوانیوں اور غیر ملکی مفادات کا نقیب بن گیا تھا، عوام کی طرف سے بجا طور پر قومی جشن منایا گیا۔ اس موقعہ پر انجمن الاخوان المسلمون فوج کی حلیف بن گئی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس انقلاب کے علمبردار اخوان ہی قرار دیئے گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فوج نے مصر میں انقلاب لانے کے لیے اس جماعت پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے سوا باقی تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا جس کے نتیجہ میں جناب حسن الہضیبی کو ملکی حالات و واقعات پر اپنا بے پناہ اثر استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات کی موجودگی میں وہ نتیجہ کیوں برآمد نہیں ہوا جس کی خواہش اور توقع کی جاتی تھی؛ وہ کیا چیز ہے جس نے انجمن الاخوان المسلمون اور انقلابی کونسل کو ایک دوسرے سے دست بگریباں کر دیا اور اس باہمی آویزش سے ملک کے اندر طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوگیا اور بیرونی ممالک میں اس کے وقار کو شدید ضرب پہنچنے لگی۔

بادی النظر میں اس دھاندلی کا سبب نہر سویز کا قضیہ ہے۔ کرنل ناصر نے حکومت برطانیہ سے جو معاہدہ طے کیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ معاہدہ ملکی مفادات کے منافی ہے لیکن اس سلسلہ میں جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ محض جذباتیت کے آئینہ دار ہیں۔ کیا کوئی بھی ایسا انسان ہے جو یہ چاہتا ہو کہ وہ دوسروں کی غلامی میں رہے یا عزتِ نفس کی نعمت سے محروم ہو کر کسی دوسرے کا مطیع و منقاد ہو جائے؟ لیکن سیاست اور ڈپلومیسی میں اس بات کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ موقع شناسی اور سیاسی تدبر کے ماتحت مصری حکومت نے بدترین حالات میں بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اگر مصری اس قابل ہوتے کہ وہ ملک سے انگریزوں کو نکال باہر کرتے تو اتنی مدت تک محض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لفظی اور استدلال میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اقوامِ متحدہ نے بھی اس صورتِ حال کی اصلاح میں کوئی قابلِ ذکر مدد نہیں کی۔ ایسے ناسازگار حالات میں کرنل ناصر نے مصر سے برطانیہ کے اخراج میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ بجائے خود ایک شاندار کارنامہ ہے۔ عام طور پر اس معاہدہ کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر وسیع پیمانے پر دوبارہ جنگ چھڑ جائے تو برطانیہ دوسری مغربی طاقتوں کی حمایت و اعانت سے نہر سویز کو اپنے تصرف میں لاسکتا ہے لیکن یہ تو ایسی بات ہے جیسے روس کی طرف سے حملہ ہونے پر امریکہ اپنی فوجیں برطانیہ، فرانس یا جرمنی کی امداد کے لیے ان ملکوں میں داخل کردے۔ اکیلا مصر اپنی مدافعت نہیں کرسکتا اور یہ مصر ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی ملک اپنی حفاظت خود کرنے کا اہل نہیں تا وقتیکہ وہ غیر جانب دار رہنے کا متمنی نہ ہو لیکن لفظی دعووں اور جنگ سے الگ تھلگ رہنے کی خواہش کے باوجود کسی ملک کا غیر جانب دار رہنا ممکن ہی نہیں بلکہ اسلامی مفادات کے نقطۂ نظر سے ایسا کرنا موزوں بھی نہیں ہے۔ مغربی ممالک اور اشتراکی دنیا کے درمیان جنگ چھڑ جانے پر فرزندانِ اسلام کے انتخاب کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ خواہ ہم ان دونوں طاقتوں میں سے کسی ایک کا حلیف ہونا پسند کریں یا نہ کریں۔

اس مطمحِ نظر کے علی الرغم مذکورہ معاہدہ کی رو سے مصر میں صنعتی ترقی اور اندرونی استحکام جیسے ضروری مقاصد کے لیے راستہ ہموار ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ زیرِ نظر معاہدہ کے مطابق مصر کو بین الاقوامی معاملات میں ایک وسیع حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اس معاہدہ کے فوائد سے مصر کہیں زیادہ متمتع ہوسکتا ہے۔

الاخوان المسلمون نے حسنِ خوبی مگر خیالی معرکے کا خدشہ ظاہر کیا ہے وہ نہر سویز کے معاہدہ کے قضیہ سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ عوام کے احساسات اور اصل حالات سے ناواقفیت کی بنا پر یہ مسئلہ کسی وقت بھی مصر کی موجودہ حکومت پر اعتراض یا نکتہ چینی کرنے کے لیے سب کو متحد و ہمخیال بنانے کے لیے ایک بہترین موضوع قرار پاسکتا ہے۔ اس قسم کا تناقضہ کھڑا کرنے کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟ ہم نے پہلے بتا دیا ہے کہ انقلابِ مصر کے آغاز میں الاخوان المسلمون کی جماعت نئی حکومت کے حامیوں میں سے تھی اور یہ جماعت ان واقعات کے رونما ہونے تک نئی حکومت کا ساتھ دیتی رہی جو امسال مارچ کے دوران جنرل نجیب اور کرنل ناصر کے درمیان پہلی جھڑپ پر منتج ہوئے۔ انقلابی حکومت اس جماعت کی ہدایت اور راہنمائی قبول کرنے کے لیے تیار تھی۔ حالات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس جماعت کا میدانِ سیاست میں کوئی حریف نہ رہا تھا پھر وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے جماعت اور اس کے قائد کو اپنا پروگرام بروئے کار لانے کا موقع نہ دیا۔ حیرت ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ نہر سویز کے معاہدہ کے سوا جسے پوشیدہ اغراض کے حصول کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، حکومت الاخوان المسلمون کے مابین تنازع یا جھگڑے کے متعلق کبھی کوئی خبر سننے میں نہیں آئی۔ اس پس منظر کی موجودگی میں حکومت اور اخوان کا تصادم غیر ضروری بلکہ بے معنی ہوتا ہے اس معاہدہ پر حسب قدر غور کیا جائے الاخوان المسلمون کی طرف سے منفی رویہ اختیار کرنے میں کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

اس باب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سارا نزاع سیاسی اقتدار کے حصول کا ہے۔ حسن الہضیبی چاہتے ہیں کہ اقتدار و اختیارات کی عنان ان کے ہاتھ میں آجائے۔ مصر اور مصری حکومت کو اس مسلح بغاوت کا سامنا کرنا پڑا ہے جس کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ اقتدار اور قوت حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی جائے اس قسم کے دہشت انگیز طریقے انتہا پسند اور بزعم خود مبنی بر صداقت تحریکوں کے مزاج میں رچے ہوتے ہیں۔ ایسی تحریکیں اعتدال پسندی، فراخدلی اور مصالحت کے جذبہ سے خالی ہوتی ہیں حالانکہ یہی جذبہ قومی تعمیر و ترقی کے تدریج اور صبر آزما مساعی کا سرچشمہ ہے جس کی بدولت ملک مغربی ثقافت سائنس اور سیاست کی عظیم روایات سے کما حقہٗ مستفیض ہو سکتا ہے۔

آپ ہی کہیئے ایسی کون سی حکومت ہوگی جو بغاوت کو برداشت کر لے گی۔ لہٰذا کرنل ناصر کی حکومت نے جو کچھ کیا ہے وہ ناگزیر تھا کیونکہ اس حکومت کے لیے ہر حالت میں اپنی مدافعت کرنا ضروری تھا۔ موجودہ صورت حال کا سارا الزام ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جنہوں نے ملک کے وسیع مفاد کی ذرہ بھر پروا نہ کی اور جن کے خیال کے مطابق ان کی دیانت و ایمان داری کے حصار ہی میں اسلام کی ترقی و سربلندی محفوظ تھی۔ حالانکہ یہ لوگ قومی نظریات کی برتری کے زعم میں ملک کو افراتفری اور لاقانونی کے غار میں دھکیل دینے کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ کچھ افراد کے دردناک انجام سے قطع نظر مصر کے عام بہی خواہ بالخصوص اسلامی ممالک میں مصر سے خیر سگالی کا جذبہ رکھنے والے اصحاب موجودہ مصری حکومت کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے سے کیسے باز رہ سکتے ہیں۔ ہم مصر کو زندہ و سلامت اور دن بدن طاقت ور ملک دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔

مصر میں حالات نے جو نہج اختیار کی ہے، وہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن میں بعض افراد نے جماعتی شکل میں اپنے مذہبی اور اخلاقی عقائد کی دھن میں ایک باقاعدہ اور منظم نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا لیکن اس قسم کی کوششیں کبھی مفید ثابت نہیں ہوئیں۔ اس قسم کے اقدام سے اگر کبھی ایک حکومت کی بجائے کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری حکومت میں جگہ لی تھی، تو اس سے خیالات نے کوئی دائمی اثر قبول نہیں کیا، جو سماج، رواداری اور فراخ حوصلگی کی تلقین کرتا ہے، اس کی مساعی ہمیشہ بار آور ہوتی ہیں، اس طرح کے سارے معاشروں میں رواداری کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے اور وہاں معاشرتی تصورات خیالات کے باہمی تبادلے اور تاثر سے تغیر پذیر ہوئے ہیں، اس کی مثال برطانیہ کے معاشرتی وسائٹیز ہیں، جن میں مسلسل تغیر ہوتا رہا ہے۔ یہ تغیر معاشرتی اور اخلاقیاتی تفکر کے تازہ ترین اثرات کی روشنی میں وجود میں آتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں بڑے حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ پاکستان کو بھی اس قسم کی پر جوش اور گمراہ کن تحریکوں کا اندیشہ ہے۔ یہاں بھی مبینہ مذہبی بنیادوں پر شورشیں برپا کی جاچکی ہیں۔ جن کا نتیجہ سخت تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ قادیانیوں کے خلاف تحریک کی اصلیت کچھ بھی ہو لیکن یہ کہنا پڑے گا کہ اس تحریک نے حکومت کے خلاف ایک کھلی بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس تحریک نے تمام پنجاب میں ہلچل پیدا کر دی اور صوبے کا سارا انتظام متزلزل ہو کے رہ گیا۔ جس کے ساتھ قتل و غارت گری اور بہیمانہ کارروائیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اور جائیداد کا بھی زبردست نقصان ہوا۔ اس تحریک کے حسن و قبح کو جانچنے کا یہ معیار نہیں ہے کہ اس میں کسی نظریہ یا عقیدہ کا سوال پیدا ہو گیا تھا، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے ملک کس حد تک متاثر ہوا؟ کسی منظم اور مربوط معاشرے میں کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے عقائد کے افراد پر اپنے خیالات اور عقائد جبر یہ ٹھونس دے۔ یہ ضروری ہے کہ جملہ تحریکیں آئینی مساعی تک ہی محدود رہیں۔ کسی مہذب سوسائٹی کے نزدیک ہر اس تحریک کو برا خیال کیا جاتا ہے جو ملک کی تباہی کا موجب ہو، خواہ اس کے مقاصد اپنی جگہ کتنے ہی مخلصانہ کیوں نہ ہوں قتل بہرحال قتل ہے، خواہ یہ محبت و خلوص کے جذبہ سے ہو یا عناد و کینہ کے ماتحت عمل میں آئے۔

ہمارے ملک میں اسلامی مملکت کے تصور اور تشکیل کے متعلق کافی بحث جاری رہی ہے، یہ کہنا کہ ہندوستان کے مسلمان کچھ اس قسم کی مملکت چاہتے تھے ایک تاریخی حقیقت ہے کیونکہ وہ اس کے حصول کے لیے نبرد آزما رہے ہیں، انہوں نے اس کے لیے مشکلیں برداشت کیں، اور قربانیاں دی ہیں، پاکستان میں غیر مسلم فرقے موجود ہوں یا نہ ہوں یہ مملکت بدرجۂ اتم ایک اسلامی مملکت ہے کیونکہ اس مملکت کا قیام مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کے عزم و استقلال سے عمل میں آیا ہے۔ اس اصطلاح کا وسیع تر مفہوم بھی یہی ہے اس پر کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلہ پر بحث و تمحیص اد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور لیے دیے ہوتی رہی ہے، مگر معمولی حد تک اس ضمن میں یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ اسلامی مملکت کی تعریف کیا ہے؟ اس سوال کا وسیع اور عام الفاظ میں یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ کوئی ایسی مملکت جس پر مسلمان حکمران ہوں، وہ اسلامی مملکت کہلاتی ہے۔ علمی، شعوری اور آئینی اصطلاح میں اس قسم کا مسئلہ خالصتاً رائے اور ذاتی نقطۂ نظر کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ چونکہ اسلام میں کلیسائی نظام کا وجود نہیں، اس لیے اس کی سیاست میں مذہبی پیشواؤں کا ادارہ بھی نہیں جسے ایسے مسئلے پر فتویٰ دینے کی پوزیشن حاصل ہوتی ہے۔ عوام زیادہ سے زیادہ علماء کے علم وفضل سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ مولانا[1] مودودی یا مولانا[1] احتشام الحق کی قسم کے لوگوں کے اس دعوے سے عام گڑبڑ پیدا ہوئی کہ ان کی رائے مستند اور صائب ہے جس کے سامنے لوگوں کو سرِ تسلیم خم کردینا چاہیے۔ اس قسم کے مذہبی علما کے کئی مکتبِ خیال ہیں جو ایک دوسرے سے پیہم برسرِپیکار رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ایک گروہ یا دوسرے گروہ کی رائے واجب التعظیم اور ثقہ کیوں تسلیم کی جائے، جب کہ اسلام اس کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ ہماری سوسائٹی جیسے وسیع الخیال معاشرے کے لیے جو ملائیت کے بندھنوں سے آزاد ہے یہ کہیں موزوں ہے کہ اس مسئلہ کو اصولِ اجماع کے مطابق عام مسلمانوں کے سامنے رکھا جائے اور ان لوگوں کی مداخلت سے جو اس مسئلہ پر کامل دسترس رکھتے ہوں، عوام کے مختلف عقائد پر مائل کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کیے جانے کے سوال پر بحث اس لیے پیدا نہیں ہوئی کہ اس کی موزونیت پر کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا بلکہ اسلامی مملکت کی صحیح تشکیل کے سلسلہ میں جو اجارہ دارانہ نوعیت کے مطالبات پیش کیے گئے تھے ان پر بحث مباحثہ شروع ہوگیا تھا اس شور وشغب میں جماعت اسلامی پیش پیش تھی۔ یہ اسلوبِ فکر ملک کے لیے تباہ کن نتائج کا حامل ہے، عوام کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ ایک مشورہ یا دوسرے مشورہ پر کان دھریں یا ان میں سے کسی ایک کو ٹھکرا دیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ آخری اختیار عوام ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام کے متعلق مشترکہ اور متحدہ طور پر رائے زنی کرنے اور افہام وتفہیم کے لیے موجودہ وقت کے پارلیمانی اداروں میں بحث مباحثے کے بہتر مواقع میسر آسکتے ہیں۔ اس بحث سے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں ہمارے خیال میں ایک مسلم معاشرے میں کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ مختلف عناصر کو مجتمع کرنے کی غرض سے اسلام کے نام پر سیاسی جماعتوں کو معرضِ وجود میں لائے۔ خواہ ان جماعتوں کا پروگرام سماجی اور اخلاقی بہبود کے اسلامی مقاصد سے آراستہ کیا جاسکتا ہو۔ سیاست میں

[1] "مولانا" کا لفظ سلہری صاحب کے ادارئیے میں نہیں ہے، معلوم نہیں ترجمے میں یہ اضافہ کس لیے کیا گیا ہے (ترجمان)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ عام بات ہے کہ سیاسی جماعتیں نکتہ چینی، باہمی آویزش اور دشنام طرازی میں مصروف ہیں۔ انگلستان میں ٹوری جماعت سوشلسٹوں کو فتنہ پرداز، بدامنی پسند اور نیچو قسم کا مورد قرار دے سکتی ہے اور اس کے جواب میں قدامت پسندوں پر یہ طنز کی جا سکتی ہے کہ وہ تنگ القلب، سرمایہ پرست ہیں، اب بتائیے کہ جماعت اسلامی جیسی کوئی جماعت اسلام کا پرچم اٹھائے اپنے مخالفوں کو کس نام سے یاد کر سکتی ہے۔ یہی نا کہ جو لوگ اس جماعت کے حلقہ بگوش نہیں انہیں کافر ملحد وغیرہ کے خطابات سے نوازا جا سکتا ہے اور حقیقت میں اس قسم کی اصطلاحات کا استعمال جماعت اسلامی کی طرف سے آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اس جماعت کے ترجمان نے ان لوگوں کو اسی قسم کے خطابات سے یاد کیا ہے جو موجودہ دستور میں ترمیم کے خواہشمند تھے، مسلم معاشرے میں ایسی صورتِ حال کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مسلمان کو کافر کہے۔ جماعت اسلامی ان اشخاص کو خارج از اسلام قرار دیتی ہے جو اس کے حلقۂ رکنیت میں داخل نہیں۔ اس نظریئے کی قانونی طور پر ممانعت کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ پابندی ان مذہبی اور تعلیمی اداروں یا جماعتوں پر عائد نہیں کی جانی چاہیے جن کا مقصد و مدعا یہ ہو کہ عوام کو اسلام اور اس کی قدروں سے روشناس کرایا جائے۔ ہمارا اعتراض صرف سیاسی جماعتوں کے متعلق ہے۔

دوسرا نتیجہ اس بات پر اثر انداز ہوتا ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں یعنی کسی ایک کی رائے دوسرے سے زیادہ قابلِ قبول کیوں ہو؟ اسی بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو علمیت موجود ہے اس کی سند اور معیار کیا ہے۔ رائے اور نظریہ بہت حد تک ماحول پر منحصر ہوتا ہے غیر ملکی حکومت لازماً ذہنوں کو متاثر کرے گی۔ لہٰذا یہ شاذونادر ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں قطعاً آزادانہ روش کے مفکر پیدا ہوں۔ اقبال ایک ایسے مفکر ہیں وہ ہر شے پر ایک وطنی مسلم زاویئے سے نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن ان کی اعانت ایک اور حقیقت بھی کرتی تھی۔ اور وہ مغربی تمدن کی روح سے ان کی کامل آگاہی اور اس کا لامحدود علم تھا۔ اسلامی مقامات نظر کی پوری روشنی رکھتے ہوئے وہ مغربی اقدار کو نہایت آزادانہ طریقے سے پرکھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ انہوں نے عمر بھر مذہبوں اور تمدنوں کا مطالعہ و موازنہ کیا، وہ جن نتائج پر پہنچے وہ قطعاً ان کے اپنے تھے۔ اس پر بھی انہوں نے باوضاحت یہ بات کہی ہے کہ دوسرے لوگ جو زیادہ اہلیت کے مالک ہو سکتے ہیں، نئے مقامات نظر سے آغاز کریں۔ لہٰذا دو شرائط مستند رائے دینے کے لیے ضروری ہیں پہلی یہ کہ ہم چونکہ ابھی غیر ملکی حکومت سے آزاد ہوئے ہیں اس لیے اس کے سیاسی و فکری اثرات ابھی باقی ہیں۔ جو لوگ ہم میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت ممتاز ہیں وہ یہی کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی بات پر کسی نہ کسی مغربی عالم کا حوالہ دے چھوڑتے ہیں۔ بالعموم حالت یہی ہے لیکن جو لوگ مستند رائے رکھنے کے دعوے دار ہیں، ان کا نقد علم بہت ہی کم ہے۔ مثلاً کسی مودودی یا احتشام الحق کا سرمایۂ علم کتنا ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی شخص یقینی طور پر نہیں بتا سکتا کہ وہ اپنے حلقۂ علم میں کتنی استعداد رکھتے ہیں لیکن وہ وقت کے تقاضوں سے یقیناً اور قطعی طور پر بے بہرہ ہیں جس میں وہ زندگی گذار رہے ہیں اور جس میں ہمارا اسلامی معاشرے کا تجربہ جاری ہے۔ قرآن کریم کو محض عربی زبان ہی میں نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ اس کے ادراک کے لیے انسان کے تمام ذخیرۂ علم اور روز افزوں معلومات کی روشنی درکار ہے کیونکہ یہ مقدس کتاب انسانی معاملات پر روشنی ڈالتی ہے جن کے پیچھے اس کی روحانی حقیقت پس منظر ہونا چاہیے۔ اسلام کا ادراک اتنے ذخیرہ علم کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اسے ایک معاشری اور سیاسی نہج پر ڈالنا تو اور بھی دشوار ہے۔

لہٰذا ہمارا مشورہ یہی ہے کہ ہمیں آج کی دنیا کو سمجھنے میں استقلال اور مسلسل کاوش سے کام لینا چاہیے۔ جوں جوں وقت گزرے گا اور ہمیں اپنی سیاسی آزادی میں زیادہ اعتماد و ادراک حاصل ہوگا، ہم آراء قائم کرنے کے زیادہ اہل ہوں گے۔ فی الحال ہم جس بات پر زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی اساسی وحدت پر یقین رکھتے ہوئے علم جدید حاصل کیا جائے کیونکہ اسلام مادی اور روحانی، دنیاوی اور سماوی اشیا کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ جب ایسے علم سے آراستہ لوگ زیادہ تعداد میں پیدا ہوں گے تو معاشرے پر لازماً ان کا اثر ہوگا جس سے مجلس قانون ساز بھی خارج نہیں۔ جو بلند تر ہوتے ہوئے تفکر کے درجہ کے مطابق بنائے گی جس طرح معاشرہ افراد کی تگ و دو سے بہتر ہو جاتا ہے اسی طرح وہ افراد کی فراست سے زیادہ باشعور بھی ہو جائے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس عمل کا اجرا کریں کیونکہ ہمیں علم کی بے حد ضرورت ہے۔ قومی ترقی کے اس مرحلے پر ہمیں جو اپنا فرض سمجھنا چاہیے وہ اول تو یہ ہے کہ ہم آئندہ نسلوں کے لیے ایک مضبوط اور ہر اعتبار سے مجتمع ملک چھوڑیں۔ دوسرے انہیں علم کا کچھ نہ کچھ ذخیرہ دیں جو ان کے کام آئے۔ بجائے اس کے کہ انہیں محدود فہم اور محض جہالت سے پیدا شدہ بندھی ٹکی آراء دے دی جائیں۔ ہمیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم آئندہ نسلوں کو نام نہاد اسلامی قوانین میں جکڑ دیں جو نیم پختہ خیالات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ وہ شخص جو ہمارے علماء کو انکسار کا درس دے گا اسلام کا سب سے بڑا خادم ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادارئیے پر تبصرہ

یہ تحریر بہت سی متفرق اور ادھوری بحثوں کی جامع ہے۔ بڑی محنت سے اس کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم ان متفرق بحثوں کو چار حصوں میں بانٹ سکے ہیں۔ ایک حصے میں سلہری صاحب نے مصر کی افسوسناک صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے اور یہ جائزہ چند اہم نتائج تک پہنچنے اور پاکستان کے لیے بیش قیمت سبق حاصل کرنے کے ارادے سے لیا ہے۔ دوسرے حصے میں پاکستان کی نظریاتی فضا کا تجزیہ کرکے یہ دکھایا ہے کہ یہاں بھی من وعن وہی صورتِ حالات سامنے ہے جیسی کہ مصر کو درپیش ہے، لہٰذا اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کچھ ویسی ہی تدابیر عمل میں لائی پڑیں گی جیسی مصر میں لائی جارہی ہیں۔ تیسرے حصے میں اسلامی ریاست کے تصور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ وہ کیا ہوتی ہے اور پاکستان کن معنوں میں اسلامی ریاست ہے۔ چوتھے حصے میں جماعتِ اسلامی پر خاص نگاہِ کرم فرمائی گئی ہے اور اربابِ اقتدار کو مشورہ دیا گیا ہے کہ اس "خطرے" سے عہدہ برا ہونے کے لیے کیا اقدام ضروری ہے۔ اسی ترتیب سے ہم بحث کے ایک ایک حصے پر اپنا تبصرہ پیش کرتے ہیں۔

(۱)

مصر کی فوجی آمریت اور اخوان

اخوان آج جس انتہائی مظلومانہ ابتلا میں سے گذر رہے ہیں اس کی اتنے بڑے پیمانے کی کوئی مثال نہ صرف یہ کہ ہمیں اپنی تاریخ کے نہایت افسوسناک ادوار تک میں نہیں ملتی، بلکہ ایشیائی، خصوصاً مسلمان ممالک پر مغربی قوموں کے جابرانہ سامراج نے بھی پچھلی دو صدیوں میں ایسے بے باکانہ استبداد کی کوئی نظیر قائم کرکے نہیں چھوڑی۔ خود اس خطۂ ہند میں برطانیہ نے ہم مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت کی باگ ڈور چھیننے میں بڑی سخت سخت کارروائیاں کی ہیں لیکن ان غیروں نے بھی اس کارنامے کی ٹکر کا کوئی خونین کارنامہ سرانجام نہیں دیا جس سے آج اپنوں نے تاریخ کو مالا مال کردیا ہے۔ اس سانحۂ عظیم پر چونکہ کرۂ ارض کے ہر گوشے میں مسلمانوں کے زخمی کلیجوں سے خون ٹپک رہا ہے اس لیے دنیا بھر میں یہ واقعہ سیاست اور صحافت کے میدانوں میں نمایاں ترین موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے اس سے قطع نظر کیجیے کہ مصر کی فوجی آمریت اور اخوان میں سے کون حق پر ہے اور کون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برسرِ غلط ہے، یا دونوں قصوروار ہیں تو کس کا حصہ کتنا ہے۔ بلکہ اُلٹا یہی طے کر لیجیے کہ اخوان مجرم ہیں، سو فیصدی مجرم ہیں اور ناقابلِ عفو مجرم ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ عدل و انصاف کے کم سے کم معیار کا جو تصور انسانیت کے اجتماعی ضمیر میں پیوست ہے، کیا اس معیار پر مصر کی آمریت کے اقدامات پورے اترتے ہیں اور دیکھنے والا مطمئن ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آمریت — اور فوجی آمریت — کا تخت بچھا ہے اور اس پر ایک طاقت جلوہ فرما ہے جس کی محض اپنی مرضی دستور، جس کا صرف اپنا ہی حکم قانون، اور جس کا فقط اپنا ہی فیصلہ پالیسی قرار پاتا ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آمریت "ہنگامی حالات" کے جس اعلان سے دستوری اور جمہوری فضا کا خاتمہ کرتی ہے اسے ایک لمبے عرصے کے لیے ملک کی تقدیر بنا دیتی ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رائے عام کی ترجمانی کر سکنے والی تمام پارٹیاں میدان سے ہٹا دی جاتی ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اختلافی نقطۂ نظر رکھنے والے اخبارات تمام کے تمام بند کر دئے جاتے ہیں اور پریس پر مستقل سنسر بٹھا دیا جاتا ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسے دہشت ناک ماحول میں اخوان کو محض نقطۂ نظر کے اختلاف کی بنا پر موجودہ واقعات سے بہت قبل کھلی کھلی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ گویا یہ بات موجودہ واقعات سے قبل طے ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں کو ختم کرنا ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے خلاف مختلف الزامات عائد کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، درآنحالیکہ وہ تردید کرنے کے لیے ذرائع و وسائل سے محروم ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اخوان کو کسی عدالتی فیصلے کے بغیر خلافِ قانون قرار دے کر کثرت سے گرفتاریاں کر لی جاتی ہیں۔ لیکن اتنے بھرپور وار سے خیالات کی وہ رَو نہیں تھمتی جو اخوان کی تحریک نے کئی برس کی محنت سے پیدا کی ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں ناصر پر ایک انوکھے انداز سے قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس کی شاید کوئی ایک نظیر بھی قاتلانہ حملوں کی تاریخ میں نہ مل سکے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عین حملے کے وقت ناصر پکارتے ہیں کہ "پکڑو، یہ کوئی اخوانی ہے"۔ پھر چند گھنٹوں کے اندر اندر طے ہو جاتا ہے کہ اس حملے کے پیچھے ایک وسیع سازش کام کر رہی ہے۔ چنانچہ دل کھول کر گرفتاریاں کر لی جاتی ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سرکاری انتظام سے اخوان کا مرکزی دفتر نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فوجی عدالت بٹھائی جاتی ہے، اور ایسی نرالی فوجی عدالت بٹھائی جاتی ہے جس کی قضا کی مسند پر خود وہی وزرائے کرام جلوہ فرما ہوتے ہیں جو برسرِ عام اخوانیوں کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار پہلے سے کرتے رہے ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ عدالت آدھ آدھ گھنٹے کی کارروائی کر کے اخوان کے اہم ترین افراد کو خوب دل کھول کر پھانسی اور عمر قید کی سزائیں سناتی ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بغیر کسی شائبہ رحم سے کام لئے، یا مسلمانانِ عالم کے جذباتِ ملی کا کوئی لحاظ کئے، پوری شانِ سنگدلی کے ساتھ جلد جلد یہ سزائیں نافذ کر دی جاتی ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظلم کی اس چکی میں پسنے کے لیے ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کھیپ ان لوگوں کی لائی جانے لگتی ہے جن کو اخوان ہونے کے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔

یہ ساری صورتِ حالات جس کا ایک ایک جزو ایسا ہے جو اسلام، جمہوریت اور عام انسانی تصورِ انصاف سے کھلم کھلا ٹکراتا ہے، ہر ایک آپ وگل کو۔ بلا لحاظ اس کے کہ وہ اخوان سے اختلاف رکھتا ہو یا اتفاق کرے۔ سر سے پاؤں تک ہلا ڈالنے والی ہے۔ ایسے واقعات انسانیت کی پچھلی تاریخ میں ہو گذرے ہوں، یا آج پیش آ رہے ہوں، مسلمان ان سے دوچار ہوں یا غیر مسلم، کمیونزم کے زیرِ اقتدار نمودار ہوں یا سرمایہ داری کی چھاؤں میں، مشرق میں ہوں یا مغرب میں، ہمارے دوستوں کو ان سے سابقہ پڑے یا مخالفوں کو، انسانی فطرت ہر صورت میں ان پر یکساں کرب محسوس کرتی ہے۔ یہ ٹھیک ایسی ہی صورت ہے جیسے آپ کے محلّے کا کوئی آدمی حویلی کا دروازہ بند کر لے، اپنے کسی ماتحت شریکِ کار کے ہاتھ پاؤں باندھ لے، اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دے اور پھر خود ہی الزام لگانے والا مدعی ہو، پھر خود ہی قاضی بن کر ایک سزا سنائے، اور آخر میں خود ہی جلّاد بن کر کوڑوں سے اس کی چمڑی ادھیڑنے کے درپے ہو جائے۔ محلّے میں اپنے خلاف اضطراب پھیلنے کی روک تھام کے لیے وہ یہ تدبیر بھی اختیار کرے کہ اپنے نوکروں کے ذریعے پرچے لکھ لکھ کر اپنے حق بجانب ہونے اور شریکِ کار کے سنگین مجرم ہونے کے دلائل ان کو فراہم کرے۔ اگر آپ کے اپنے پڑوس میں کسی فرد کو اس طرح کے ظلم کا شکار بنایا جا رہا ہو تو اپنے قلب کے بارے میں آپ کا اندازہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا ہے کہ وہ پگھلے گا یا نہیں ؟ اس سے آگے بڑھ کر اگر یہی صورت کسی جماعت یا تحریک کو کسی حکومت کے نیچے پیش آجائے تو یہ ایک فرد کی مظلومی سے ہزاروں گنا وسیع دائرۂ اثر رکھتی ہے اور سوائے پتھر اور لوہے کے مجسموں کے اور کوئی اس پر بے چین ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مگر استثنیٰ ہر عمومیت میں ضرور نکل آتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارے اندر موجود ہیں جو اخوان کے لیے کسی جذبۂ ہمدردی سے بالکل خالی ہو کر مصری آمریت کے اس کارنامے کے لیے جواز کے دلائل پیش کرتے پھرتے ہیں۔ اکتفا اتنے ہی پر نہیں، اپنے اپنے قصرِ صحافت کی منڈیروں پر گھی کے چراغ جلا جلا کر اس طرح خوشی منا رہے ہیں کہ جیسے عمروں ترسنے کے بعد پہلی مرتبہ ان کے دلی ارمان پورے ہوئے ہوں۔ یہ پورے زورِ قلم سے مصری آمریت کو داد دے رہے ہیں کہ یہ تھا کرنے کا اصل کام جو تم نے جرأت مندی سے کر ڈالا۔ اور پھر اپنے حکمرانوں کے سامنے اسے اسوۂ حسنہ بنا بنا کے رکھ رہے ہیں کہ حضور! اسلام اور جمہوریت اور ملک اور عوام کی سب سے اونچی خدمات انجام دینے کے تو یہ ڈھنگ ہیں۔ یہ پوزیشن ابھی تک صرف ملت، الفضل اور سول اینڈ ملٹری گزٹ جیسے جرائد کی طرف سے ہمارے سامنے آئی تھی۔ ان جرائد کی پالیسی کے متعلق چونکہ ہماری ایک مستقل رائے ہے کہ وہ ایسے مذہبی فتنوں کو اپنے پس منظر میں رکھتے ہیں جو کبھی آدمی کو عالی ظرفی سے مالا مال ہونے کا موقع نہیں دیتے اس لیے ان کا اپنے جذبات کو سنبھال نہ سکنا کچھ عجیب نہیں لگا۔ مگر آپ کا یہ اداریہ پڑھ کر ہمارے اس حسنِ ظن کو کچھ نہ کچھ ٹھیس ضرور لگی ہے جو پریس کے روز بروز پستی کی طرف لڑھکنے کے باوجود ممتاز اخبارات کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک قائم ہے۔

اب آپ اپنے اداریے کا ایک بار خود ناقدانہ جائزہ لے کر دیکھیے۔ آپ پیرایۂ آغاز میں "اخوان المسلمون اور ان کے مرشدِ عام کا دردناک حشر" کے الفاظ سے بات شروع کرتے ہیں اور اس کو "دکھ اور کرب کا معاملہ" قرار دیتے ہیں، لیکن کل ۲۶ الفاظ میں یہ سارا دکھ اور کرب پیش کر کے ساڑھے پانچ سطروں کے بعد آپ ایک "مگر" (BUT) استعمال کرتے ہیں جس کی سرحد سے آگے پورے کا پورا میدانِ بحث اخوان کے خلاف جمال ناصر اور اس کے اقدام کی حمایت کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ اس "مگر" کے بعد کہیں ایک رتی بھر "دکھ اور کرب" محسوس نہیں ہوتا، بلکہ الٹا اظہارِ اطمینان کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس دکھ اور کرب کی داستان کو آپ ہمارے صفحے کے چار لمبے لمبے کالموں میں لکھ گئے مگر عدل و انصاف کے اسلامی یا جمہوری اصولوں کی روشنی میں آمری اقدامات کا سرے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ نے جائزہ نہیں لیا۔ اس معاملے میں آپ نے دلیل کی بجائے تمام تر انحصار وجدان پر کیا ہے۔ بس یہ واقعات چونکہ آپ کو پسند آ گئے ہیں، لہٰذا وہ جس بھی اسلوب سے کر ڈالے گئے ہوں عین حق اور بہمہ صواب ہیں۔ پورا مضمون پڑھ جانے کے بعد خود بخود یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخر اوپر کے ان تمہیدی ۲۶ الفاظ کا اس تحریر میں مصرف کیا ہے۔

ایک ہی فریق ـــ اور غالب فریق، جس نے دوسرے فریق کا منہ بھی بند کر رکھا ہو ـــ کے دعویٰ کو من و عن لے کر اس پر رائے قائم کرنا اور پھر اپنے اداریے میں ایک طرفہ رائے سے پاکستان کے لیے ایک "درسِ عبرت" پیدا کرنا خواہ مخواہ اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ فاضل مدیر پہلے سے یہ درسِ عبرت اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور مصر کی تاریخِ امروز کو انھوں نے اپنے رجحانات کے سانچے میں ڈھال کر ایک شئے معہود کے لیے استعمال کر ڈالا ہے۔ چنانچہ سارے کا سارا اداریہ بول کر کہہ رہا ہے کہ خود پاکستان میں ایسی دو طاقتیں ان کے سامنے ہیں جن میں سے ایک کو وہ اخوان کی جگہ رکھتے ہیں، دوسری کو ناصری آمریت کی جگہ اور پھر غیر جانب دار مبصر بن کر نہیں، بلکہ موخر الذکر طاقت کے وکیل بن کر کلام فرماتے ہیں:

معاہدۂ سویز | بہرحال اخوان اور ناصر کے اختلاف کا تجزیہ کرنے کے لیے سلہری صاحب فرماتے ہیں کہ ایک آڑ کی حیثیت میں اخوان نے معاہدۂ سویز کے اختلاف کو استعمال کیا ہے۔ افسوس ہے کہ سلہری صاحب کو اس سلسلے میں پوری صورتِ حالات کا علم نہ ہو سکا۔ واقعات یوں ہیں کہ معاہدہ کا سوال جب اٹھایا گیا تو اس وقت مصری موقف یہ تھا کہ پہلے علاقۂ سویز کو برطانیہ اپنی فوجوں سے خالی کر دے، پھر معاہدہ ہو سکے گا۔ لیکن برطانیہ جیسی گھاگ طاقت محض بیانوں اور درخواستوں سے تو اپنی روش نہیں بدل لیتی، وہ تو صرف طاقت کو مانتی ہے۔ مصر کے جنتا راج نے ضرورت محسوس کی کہ برطانوی فوجوں کے لیے مصر میں ٹکنا ناممکن بنا دیا جائے۔ یہ مہم اخوان کے سپرد ہوئی کہ وہ گوریلا وار کا سلسلہ شروع کر دیں۔ چنانچہ برطانیہ نے اس وقت معاہدہ کرنے کے لیے اپنی اکڑی ہوئی گردن کچھ نیچے کو جھکائی ہے جب اخوان نے علاقۂ سویز میں اس کے فوجیوں کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ آخر جن لوگوں نے انگریز کو معاہدہ تک لانے کے لیے اپنا خونِ رگِ جاں پیش کیا تھا اس معاملہ میں ان کی دلچسپیوں کا گہرا ہونا بالکل قدرتی امر تھا۔ اخوان کی یہی گہری دلچسپی تھی جس کی وجہ سے خود برطانوی نمائندے نے محض ناصر سے گفت و شنید کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اخوان کے مرشدِ عام سے بھی براہِ راست گفتگو کر لینا ضروری سمجھا اور اس بارے میں خود ناصر سے بات بھی کر لی۔ مصر کی وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقبولِ عام منظم طاقت جس نے برطانوی فوجی طاقت کے لیے امن چین کا سانس لینا حرام کر رکھا تھا، برطانیہ اس کے بارے میں مطمئن ہوئے بغیر کس طرح ایک کاغذی معاہدے پر انحصار کر سکتا تھا۔ شیخ حسن الہضیبی سے ایونز نے ملاقات کی درخواست کی۔ شیخ موصوف نے اس کی اطلاع فوراً کرنل ناصر کو دی۔ کرنل ناصر کے علم میں لاکر یہ ملاقات کی گئی۔ ملاقات کے بعد شیخ موصوف نے پوری رپورٹ بھی ناصر کو پہنچا دی۔ شیخ حسن الہضیبی یا اخوان کے نقطہ نظر سے معاہدہ کی مجوزہ شکل تمام تر برطانیہ کے مفاد میں جا رہی تھی۔ برطانیہ کو جو مقصد کروڑوں پونڈ کے سالانہ خرچ سے علاقہ سویز میں فوج رکھ کر حاصل تھا اب اس معاہدہ میں مصر کو باندھ لینے کے بعد بغیر اس خرچ کے حاصل رہے گا یعنی ترکیہ اسرائیل یا کسی دوسری حلیف عرب ریاست کے لیے خطرہ پیدا ہو جانے کی صورت میں برطانیہ اپنی بین الاقوامی ضروریات کے تحت مصر میں جب چاہے فوج اتار سکتا ہے اور حکومتِ مصر اس میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ اخوانی نقطہ نظر یہ تھا کہ آئندہ جنگ کی صورت میں ہم برطانیہ سے ایک آزاد ریاست ہونے کی حیثیت میں تعاون کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اپنی آزادی اور ساورنٹی کو مستقل طور سے گرو نہیں رکھ سکتے۔ اخوان نے آخری درجے میں یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ اس معاہدہ کی حتمی توثیق اس وقت تک عمل میں نہ لائی جائے، جب تک مصر کی ایک منتخب پارلیمنٹ اسے منظور نہ کر دے، اس سے قبل مصری عوام اور پریس کو اس معاہدے پر آزادانہ تبصرے کا حق حاصل رہنا چاہیے۔

مصر کی رائے عام، باوجود اظہار پر ہزار بندشیں ہونے کے صریحاً اسی اخوانی موقف کے حق میں تھی چنانچہ بعد میں جب ناصر اور ایونز کا گٹھ جوڑ ہو گیا تو فوج اور سول سروس کے حلقوں سے بے شمار قیمتی اور محب وطن اشخاص کو نکال باہر کرنا پڑا۔ یونیورسٹی کے حلقے سے چالیس پروفیسروں نے اس گٹھ جوڑ کے خلاف اظہار رائے کیا اور وہ سب کے سب نکال دئیے گئے۔ بہر حال جب ایونز اور ناصر اخوان کے بارے میں ناامید ہو گئے تو دونوں کے نزدیک یہ ناگزیر ٹھہرا کہ معاہدہ کرنے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے مصر کی اس خیر خواہ طاقت کا قلع قمع کرنا ضروری ہے جس کی قربانیوں نے ناصر کے ہاتھ مضبوط کیے تھے اور اسے انگریز کو معاہدہ تک کھینچ لانے کے قابل بنایا تھا۔ جن لوگوں کے خون سے اس معاہدہ کے حروف لکھے گئے ہیں، آپ کس مزے سے ان کے بارے میں صحافت کی آرام کرسی پر بیٹھ کر یہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ معاہدہ کو آڑ بنا کر استعمال کر رہے ہیں۔

اخوان کے موقف پر فوجی آمریت کی جانب سے جرح کرتے ہوئے سلہری صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ کیا آدم کا کوئی ایسا بیٹا ہو سکتا ہے جو غیر کے سامنے جھکنے پر تیار ہو جائے ؟" اس جرح کے جواب میں سب سے پہلے تو ہم یہ پوچھیں گے کہ کیا آپ نے اُس وقت بھی یہ سوال اٹھایا تھا جب مسلم لیگی حلقے جدوجہدِ پاکستان میں مولانا حسین احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، جمعیت العلمائے ہند اور دوسرے کانگریسی کارکنوں کے بارے میں ہر سر سانس یہ کہتے تھے کہ یہ سب ہندوؤں کے ہاتھ بِک گئے ہیں ؟ کیا یہ سوال آپ نے اس وقت بھی اٹھایا تھا جب شیخ عبداللہ کشمیری لیڈر کے بارے میں بچہ بچہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے مسلمان قوم کے مفاد کے خلاف نہرو اور پٹیل سے سازباز کر لی ہے ؟ دوسرے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری مسلم سلطنت کی اسی برِعظیم کی تاریخ میں جعفر اور صادق کی طرح کے جو لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، وہ کیا انسانی نطفے سے پیدا نہیں ہوئے تھے ؟ اس کے بعد ہم اس مسئلے میں روشنی حاصل کرنے کے محتاج ہیں کہ کیا دنیا کی ڈپلومیٹک تاریخ میں ایسے سودوں کی مثالیں بکثرت موجود نہیں ہیں جن میں مختلف سلطنتوں کے فرماں رواؤں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے قومی مفاد کو داؤں میں لگا دیا ہو، یا کم از کم اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے کسی مالی امداد کے حاصل کرنے یا کسی وقتی مسئلے سے بچنے یا کسی قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنی متاعِ آزادی و حاکمیت کو ہاتھ سے دے دیا ہو۔ کیا خود اسی نہرِ سویز کی پچھلی تاریخ اس بات کی شہادت فراہم نہیں کرتی کہ آدم کے ایسے بیٹے گذرے ہیں جنہوں نے اپنے ملک کے مفاد کے خلاف دوسری قوموں سے معاہدے کیے ہیں ؟ سلہری صاحب جیسے اخبار نویس کو اس سے ناواقف نہیں ہونا چاہیے کہ مغربی اقوام نے ایشیائی اور مسلم ممالک کو تلوار کے زور سے کبھی مسخر نہیں کیا، ہمیشہ ایسے معاہدوں کے جالوں میں پھانسا ہے جن میں ادنیٰ درجے کے فائدوں کے عوض وسیع پیمانے پر اپنے لیے مفاد حاصل کیے ہیں۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ کہاں بددیانتی نے کام کیا، کہاں حماقت نے اپنا کرشمہ دکھایا اور کہاں محض کمزوری سے گل کھلائے۔ سلہری صاحب دنیا کی ڈپلومیٹک تاریخ کے ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی بددیانتی، غداری اور حماقت کی دردناک داستانوں پر اپنے ایک سوالیہ جملے سے خطِ تنسیخ کھینچ دینا چاہتے ہیں۔

چلیے، ہم بغیر کسی بحث کے مانے لیتے ہیں کہ معاہدۂ سویز اپنی موجودہ شکل میں بہترین ہے، عوام کے مفاد سے اقرب ہے۔

ؔ ابھی چند ہی روز پہلے ناصری آمریت نے علی الاعلان اخوان پر یہ بے تکا الزام لگایا تھا کہ وہ انگریزوں سے سازباز کر رہے ہیں، اور پھر حالیہ استبدادی مہم کے دوران میں ایک سازش پکڑنے کی خبر دیتے ہوئے اُس سے زیادہ نامعقول الزام یہ لگایا گیا کہ اخوان یہودیوں سے گٹھ جوڑ کیے ہوئے تھے۔ کیا سلہری صاحب نے ان الزامات کے جواب میں اخوانیوں کی مدافعت کے لیے بھی ایسا کوئی سوال اٹھایا ہے ؟ آخر وہ بھی تو آدم ہی کے بیٹے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اخوان اسے محض ایک آڑ بنا کر حصولِ اقتدار کی جدوجہد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے مفیدِ عوام معاملات کو طے کرنے کے لیے آمرانہ استبداد کی ہولناک فضا پیدا کرنے اور رائے عام کا گلا گھونٹ رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ کیوں نہ ایسے اہم اور پوری قوم کے نفع و نقصان سے تعلق رکھنے والے مسئلے کو ایک کھلی جمہوری فضا میں قوم کے سامنے رکھا گیا؟ کیوں نہ لوگوں کو اس پر اظہارِ رائے کے پورے پورے مواقع دئے گئے؟ کیوں اسے ایک ایسی فوجی ڈکٹیٹرشپ کے ذریعے قطعیت سے طے کر دیا گیا جو محض ایک عارضی حیثیت سے دستوری زندگی کو معطل کر کے کام چلا رہی ہے اور جس کا کام صرف جمہوریت کے لیے راستہ صاف کر کے واپس اپنی بارکوں میں سمٹ جانا ہے؟ قوموں اور ملکوں کی قسمت کا سالہا سال کے لیے ایک یا چند افراد کا اس طرح کی خدائی حیثیت اختیار کر کے فیصلہ کر ڈالنا، ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ کدھر سے معقول ہے۔ اس بارے میں ہم سلہری صاحب کی رہنمائی کے بہت ہی محتاج ہیں۔

سلہری صاحب کا معاہدہ کی موجودہ شکل کے حق میں استدلال یہ ہے کہ چونکہ غیر جانبداری ممکن نہیں رہی اور داخلی استحکام اور صنعتی ترقی کے لیے بڑی بڑی مغربی طاقتوں کی امداد حاصل کرنا بالکل ناگزیر (BADLY NEEDED) ہے لہٰذا مصری آمریت نے اس مجبورانہ پوزیشن سے ممکن حد تک بہترین نتیجہ پیدا کر لیا ہے۔ اور پیشِ نظر معاہدہ نے مصر کے بین الاقوامی اثر و رسوخ کو بہت بڑھا دیا ہے۔

اس استدلال کے مقدمات سے کسی نہ کسی حد تک ہمیں بھی اتفاق ہے۔ مثلاً یہ بات کہ آئندہ جنگ کے لیے جو دو دھڑے پیدا ہو گئے ہیں، ان میں سے ایک کی کمان کمیونزم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ہاتھ میں۔ ان دونوں میں جب بھی انتخاب کا سوال پیدا ہوتا ہے تو بہت سے عوامل ایسے ہیں کہ جن کے تحت ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان ممالک کا رجحان کمیونزم کے مخالف دھڑے ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ غیر جانبدارانہ پوزیشن قائم رکھنے کا امکان اگرچہ موجود ہے لیکن عملاً یہ صورت مشکل سے نبھائی جا سکتی ہے لیکن سلہری صاحب کا ذہن جس طریقے کی وکالت کر رہا ہے اس کا نکالا ہوا یہ نتیجہ کہ اگر غیر جانبداری ممکن نہ ہو اور کسی ایک کے ساتھ لگنا ضروری ہو تو پھر سیدھے اچھل کر اس کے گھڑے کی مچھلی بن جانا چاہیے اور اس کے بعد اظہارِ اطمینان کرنا چاہیے کہ بس یہی بہترین صورت تھی جسے ہم نے اختیار کر لیا ہے۔ جس کے ساتھ لگو، پوری طرح آمنّا و صدّقنا کہہ کر آزادی، خودداری، استقلال اور عزت وغیرہ جیسی چیزوں کو اس کے قدموں میں ڈال دو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈپلومیٹک تاریخ ہزاروں مثالوں سے گواہی دیتی ہے کہ بڑی اور سربراہ کار طاقتوں کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ وہ چھوٹی قوموں سے من مانے شرائط پر معاملات طے کریں۔ دوسری طرف چھوٹی قومیں پوری پوری تدبیریں اختیار کرتی ہیں کہ وہ کسی طرح اپنی آزادی اور حاکمیت اور اپنے اہم مفاد کو بچا کر سمجھوتے کریں۔ چنانچہ آج بھی امریکہ و برطانیہ اس امر کے درپے ہیں کہ وہ کچھ ڈالر یا فوجی اسلحہ یا محدود سا بین الاقوامی تعاون قیمت میں دے کر چھوٹی چھوٹی نوخیز بالخصوص مسلمان قوموں کے اوپر بھرپور ہاتھ ماریں۔ ایسی صورت پیش آجانے پر اگر کسی نوخیز قوم کو مخلص اور بیدار مغز اور حقیقی ولولہ کار رکھنے والے حکمران نصیب ہوجاتے ہیں تو وہ ڈپلومیٹک دائرے میں اپنی مضبوط پالیسی کے ذریعے دوررس منصوبہ بنا کر لمبی کشمکش کرتے ہیں۔ وہ ایک طرف قومی بقاء اور تعمیر و ترقی کا اصل دارومدار اپنے عوام کی بیداری، تنظیم اور حرکت پر رکھتے ہیں، دوسری طرف اپنی ضروریات و مشکلات کے بارے میں کسی طرح کا اضطراب اور ان کو حل کرنے کی فکر میں کسی غیر ملکی امداد کے لیے بے چینی دکھائے بغیر فیصلہ کن طاقت اپنی رائے عام کو قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ گاندھی جی کے بارے میں مشہور ہے کہ جب کبھی برطانوی حکومت کے نمائندوں سے گفتگو ہوتی تو گاندھی جی یہ کہا کرتے تھے کہ میں کیا کرسکتا ہوں فیصلہ تو کانگریس کے ہاتھ میں ہے، یا کہتے کہ میں تو مان جاؤں لیکن جنتا نہیں مانتی۔ گاندھی جی کی مثال تو دور کی ہے ہمارے اپنے ہاں قائد اعظم کی سیاسی بصیرت نے یہی روایت زیادہ شاندار طریق سے قائم کی ہے۔ موصوف نے جب کبھی بھی برطانوی وائسرائے یا کسی مشن سے گفت و شنید کی ہے تو ہمیشہ یہ بات کہی ہے کہ یہ اور یہ کچھ تو میری قوم کا مطالبہ ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں کرسکتا یا یہ کہ فیصلہ مسلم لیگ کی کونسل کے ہاتھ میں ہے، میرا کیا اختیار! یہ محض ایک ہتھکنڈہ نہیں ہوتا، درحقیقت ایک لیڈر یا حکمران جتنی اہمیت عوام کو دیتا ہے اور جتنی ساکھ اپنی قوم کی بناتا ہے خود اس کی اپنی اہمیت اور ساکھ اسی پیمانے پر بنتی ہے۔ ان طریقوں سے لیڈر اور حکمراں ڈپلومیٹک دائروں میں معاملات طے کرنے کے لیے اپنی قوتِ معاملہ گری (BARGAINING POWER) کو بڑھاتے ہیں۱؎۔

بخلاف اس کے جب باگ ڈور کسی نادان قیادت کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے تو وہ اپنی ضروریات اور مشکلات کا

۱؎ یہی پالیسی کسی نہ کسی حد تک ہمارے ملک کے اندر مرحوم لیاقت علی خاں کے عہد تک برقرار رہی۔ اسی پالیسی نے ابتدائی چند سالوں میں پاکستان کی ساکھ اور اہمیت پیدا کی۔ لیاقت علی خاں کے بعد سے اکابر نے اپنی پالیسی کو کمزور کرنا شروع کیا۔ اور اب جہاں نوبت پہنچ گئی ہے، واضح ہے۔ لیاقت مرحوم خود بھی امریکہ سے امداد حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے مگر بغیر اپنے ملک کو گرائے اور بغیر جلد بازی سے کام لیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رونا برسرِعام رونے لگتی ہے، وہ چوراہوں پر کھڑی ہو کر واویلا کرتی ہے کہ اگر ہمیں فلاں ملک سے امداد نہ ملی اور فلاں سے جلد از جلد سمجھوتہ نہ ہو سکا تو ہم ختم ہو جائیں گے۔ وہ اپنے عوام کو تقریروں اور اخباری تحریروں کے ذریعے لگی لپٹی رکھے بغیر یہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ اگر فلاں کا دامن تھامنے سے تم نے ہمیں روکا تو پھر تم کہیں کے نہ رہو گے، بلکہ وہ خود بڑی طاقتوں کے سامنے جا کر اپنا سارا بھرم کھول دیتی ہیں کہ ہم تو اب ایک دن بھی آپ کے سایۂ شفقت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس پر جب وہ طاقتیں ان سے یہ دریافت کرتی ہیں کہ آپ اپنے عوام کو کسی صورت معاملہ پر کس طرح راضی کر سکیں گے تو وہ پہلے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہمارے عوام احمق، جاہل، بدھو اور غیر موثر طاقت ہیں۔ اصل چیز ہم ہی ہم ہیں، جو کچھ ہم کر دیں گے اس سے کوئی عمومی اختلاف نہیں ہو گا۔ چند آوازیں اٹھیں گی بھی تو از خود ٹھنڈی پڑ جائیں گی۔ لیکن دنیا کی بڑی بڑی کائیاں طاقتیں حالات کو اتنی سرسری نگاہ سے تو نہیں دیکھتیں، وہ ایسی قیادتوں سے زیادہ وضاحت کے ساتھ جانتی ہیں کہ کسی ملک میں عوام کے اندر کیا کیا رجحانات پائے جاتے ہیں اور کس کا کتنا زور ہے۔ چنانچہ وہ پھر نام لے لے کر پوچھتی ہیں کہ فلاں فلاں کو کس طرح ساتھ لے سکیں گے؟ اس پر بھولی بھالی قیادتیں اپنے مضبوط اقتدار کا حوالہ دے کر ان کو اطمینان دلاتی ہیں کہ ان طاقتوں کو ہم کچل کے رکھ دیں گے۔ یہاں پہنچ کر ان کی قوتِ معاملہ گری آخری نقطہ پر آ گرتی ہے۔ پھر اُن سے منوانے والے جو کچھ چاہتے ہیں، منواتے ہیں۔ میز کی لڑائی یکسر ہر جاتی ہے۔ جو لوگ اپنوں کو کچل کر غیروں سے معاہدے باندھتے ہیں وہ ملکی مفاد کی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں۔

یہی صورت معاہدۂ سویز میں پیش آئی۔ بیرونی امداد کا حصول، صنعتی تعمیر، داخلی استحکام اور بین الاقوامی اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے قطعی ناگزیر ٹھہرا۔ غیر جانب داری ناممکن محسوس ہوئی لہٰذا جانب داری کی ہر لپیٹ سے لپٹ صورت کو جلد از جلد اختیار کرنا طے پایا۔ مطالبہ ہوا کہ انگریزوں سے معاہدہ کرنا ہو گا، یہ معاہدہ ہو گیا۔ تقاضا ہوا کہ اسرائیل سے تعلقات درست کرنے ہوں گے اور ان کے جہازوں کے لیے سویز کو کھول دینا ہو گا، تعلقات درست ہو گئے اور آج یہودیوں کے سامان سے بھرے ہوئے جہاز سویز کی موجوں پر سے گذر رہے ہیں۔ چاہا گیا کہ اخوان کا روڑا دوستانہ تعلقات کے راستے سے ہٹا دیا جائے، چنانچہ فوجی عدالتیں قائم ہو گئیں اور اخوان کے لیے پھانسیاں گاڑ دی گئیں۔ سلہری صاحب جس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہیں اس میں رہتے ہوئے وہ مشکل ہی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ناصری آمریت نے کتنا کمایا اور کتنا زیادہ کھو دیا ہے۔ ایک طرف بالکل کنارے بیٹھ کر انگریزوں نے اخوان سے انتقام لے لیا، دوسری طرف اخوان جیسی منظم طاقت سے خود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناصر کو محروم کر دیا جس کے تعاون سے وہ معاہدہ طے کرنے کے قابل ہوا تھا۔ تیسری طرف مصر کے عوام کے اعتماد کی زمین آمریت کے قدموں تلے سے نکلوا دی، چوتھی طرف مسلمان ممالک کی وحدت کو سخت دھکا لگوا دیا، پانچویں طرف احیائے اسلام کی ایک ایسی قابلِ قدر تحریک کو کمزور کر دیا جس کا اثر پورے عالمِ اسلام میں پھیلا ہوا تھا اور جس کی دعوت مسلمانوں میں زندگی کا نیا ولولہ پیدا کرنے کا موثر ذریعہ تھی۔ اب ناصری آمریت کو اس درجہ کمزور کر لینے کے بعد آئندہ جو معاملات ہوں گے، آپ جیسا اخبار نویس کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کر سکتا ہے کہ ان میں مصر کا پلڑہ اور کتنا ہلکا ہو جائے گا۔

سلہری صاحب بتائیں کہ جو لوگ ڈپلومیٹک میدان میں اپنی قوموں کے نادان دوست بن کر یہ بودی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہوں اور جو ڈھنڈورہ پیٹیں کہ لوگو سن لو ہم غیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ ہم اپنے بل بوتے پر تعمیر و ترقی کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ ہم بغیر غیر ملکی امداد کے ایک دن جی نہیں سکتے اور پھر جو اپنے عوام کو مکھی اور مچھر کے برابر وقعت نہ دیں بلکہ ان کی جہالت اور ان کے جمہوریت کے نااہل ہونے کا اشتہار دیتے ہوں، اور بڑی طاقتوں کو تسلی دلاتے ہوں کہ ہمارے فیصلوں کے خلاف جو سرتابی کرے گا اسے ہم نابود کر کے رکھ دیں گے، اُن کے ہاتھوں کوئی معاہدہ بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ جس میں نفع کمانا تو الگ رہا، معاملہ برابر برابر کا طے ہو جائے؟ کیا ان کے بارے میں یہ فارمولا پیشِ نظر رکھنا کافی ہے کہ "آدم کا کوئی بیٹا کسی غیر کے آگے جھکنے پر تیار نہیں ہو سکتا"؟ سمجھ دار حکمراں اور لیڈر ہمیشہ اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ بین الاقوامی سمجھوتوں کے لیے جب بھی بات چیت ہو، بلکہ بات طے ہو جانے کے بعد بھی عوامی دائرے میں کوئی نہ کوئی عناصر ایسے موجود رہیں جو معاہدوں کے کمزور پہلوؤں پر اضطراب دکھائیں اور ان پر ناقدانہ نظر ڈالتے رہیں تاکہ ان کے ہونے سے اپنی قوتِ معاملہ گری کو مضبوط تر رکھا جا سکے، نیز بعد میں بھی اپنی قومی خود داری میں کمی نہ ہونے دی جائے اور زیادہ بہتر نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ اب جن لوگوں کو نہ بات چیت کے دوران میں کسی کا اختلاف گوارا ہو، نہ بات طے کر لینے کے بعد تنقید کے لیے قوتِ برداشت رکھتے ہوں وہ جمال ناصر سے زیادہ شاندار کارنامے کیسے انجام دے لیں گے؟

بیرونی امداد انڈیا کے حکمرانوں نے بھی حاصل کی ہے لیکن اپنی آزادی، حاکمیت، بڑے بڑے مفاد، اور قومی خود داری پر بھی آنچ نہیں آنے دی۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے عوام کو اعتماد میں لے لیا، رائے عام کو زندہ رہ کر حالات پر اثر انداز ہونے کا موقع دیا، قوم کو معاملات کے بارے میں ہر اسٹیج پر آگاہ کیا، اختلافی نقطہ ہائے نظر رکھنے والوں کو تنقید کا اذن دیا۔ کیا امریکی امداد لینے کے لیے نہرو گورنمنٹ نے بھی کسی دوسرے ملک سے سمجھوتہ کرنا اپنے اوپر لازم ٹھہرایا؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا کسی جماعت اور تنظیم کو خنجر برّاں ہاتھ میں لے کر ملیامیٹ کرنے کا کوئی کارنامہ سرانجام دیا؟ کیا اپنے دروازے دوسروں پر چوپٹ کھول دیئے کہ آؤ یہ چراگاہ تمہارے لیے بالکل کھلی ہے؟

پالیسی کا ایک راستہ یہ تھا، لیکن افسوس کہ ہمارے ممالک کی تینوں حکومتیں اس کے بجائے دوسرے راستے پر چل نکلی ہیں، یعنی چونکہ غیر جانبداری ممکن نہیں رہی اور تعمیر واستحکام کے لیے کسی طرف سے مدد کا حصول بالکل ناگزیر ہے، لہٰذا سب کچھ دے کر جلد سے جلد معاملہ طے کر لینا چاہیے۔ اس بودی پالیسی پر اخوان جیسے خیر خواہانِ ملک وملت اگر کڑھے ہوں اور ان کا دردِ دل اظہارِ اختلاف پر مجبور ہو گیا ہو تو یہ کونسی ایسی بات تھی کہ آمریت تلوار لے کر پل پڑتی! بس یہ کافی تھا کہ وہ عوام کو معاہدہ کے بہترین ہونے کا یقین دلا دیتی اور اخوان کا اختلاف اجتماعی فیصلے کی رو کے آگے چار دن بھی نہ ٹھہر سکتا۔ اخوان کو رائے عام کے زور سے شکست دینے کے بجائے استبداد کا نشانہ بنانا اس امر کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ رائے عام آمریت کے حق میں نہیں تھی اور جمال ناصر اس بات سے بھی مایوس تھے کہ وہ مزید کوشش کے بعد دلیل کی قوت سے قوم کو ساتھ لے سکتے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی اگر اتنی کم سے کم حکمت وبصیرت انقلابی کونسل میں موجود ہوتی جتنی کسی ملک کا کارپرداز بننے کے لیے ضروری ہوتی رہتی ہے تو جمال ناصر ایک طرف مغربی طاقتوں سے تقاضا کرتے کہ میری قوم اس حد تک جانے پر تیار نہیں ہے، آپ کو موجودہ شرائط سے پیچھے ہٹنا پڑے گا، اور دوسری طرف خود قوم کو یہ تسلی دلا کر کہ ہوگا وہی کچھ جس پر تم راضی ہوگی، مزید افہام وتفہیم کا سلسلہ جاری رکھتے اور عوامی رجحانات کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سازگاری پیدا کرتے۔ اس طرح آمریت کی قوتِ معاملہ گری میں بھی اضافہ ہوتا اور معاہدہ کے لیے داخلی فضا بھی بغیر خون خرابے کے تیار ہو جاتی۔ لیکن وہاں تو جلدی تھی اور ذہن قومی مفاد کے فیصلے کرنے کی اجارہ داری کے نشے میں تھا۔ جیسے جمال ناصر کو اپنی کسی ذاتی جاگیر کا کوئی معاملہ طے کرنا تھا اور وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ جی ہاں، وقت اس معنی میں ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا کہ آمریت کے ناپائیدار تخت کے پائے رائے عام کے عدمِ اطمینان کی وجہ سے متزلزل ہو رہے تھے۔ کیا معلوم کس لمحے کیا ہو جائے!

سلہری صاحب کی بصیرت کی روشنی ہم پر یہ واضح کرتی ہے کہ اس معاہدہ سے مصر کا بین الاقوامی اثر ورسوخ بڑھ گیا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دوسروں کے حسب درجے کے مطالبے مان کر یہ اثر ورسوخ حاصل کیا گیا ہے، اس کے ذریعے اب مصر اپنے اور اسلامی دنیا کے کتنے ایک پیچیدہ مسائل کو بین الاقوامی طاقتوں کے تعاون سے حل کرا لیتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہودی ریاست کا مسئلہ ہے، ٹیونس، المغرب اور الجیریا کا مسئلہ ہے، پاکستان کے سامنے کشمیر اور نہری پانی کا مسئلہ ہے۔ اب یہ سب مصر کے بین الاقوامی اثر و رسوخ سے حل ہو جائیں گے۔ پوزیشن ٹھیک وہی ہے جیسے غلام ہندوستان میں گورنر کے کسی دربار میں جب ایک ہندوستانی جمعدار یا کسی جاگیردار کو اپنی خدمات کے عوض کرسی مل جاتی تھی تو اس کے خاندان اور علاقے کے لوگ محسوس کرتے تھے کہ اس کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ اثر و رسوخ کبھی ان قومی و ملکی مسائل کے کام نہ آ سکا جن سے عوام دوچار رہتے تھے، اس طرز کا اثر و رسوخ خود سامراج ہی کے کام آتا رہا۔ مصر نے ٹھیک اسی قسم کا بین الاقوامی اثر و رسوخ حاصل کیا ہے۔ وہ اپنا سرِ افتخار اس خیال سے بلند کر سکتا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی سرپرستی مجھے حاصل ہے، لیکن اس خیال کے غبارے سے اس دن ساری ہوا نکل جائے گی جس دن مصر نے کوئی ایسا مسئلہ چھیڑا جو ان سرپرستوں کے مفاد کے خلاف پڑنے والا ہو۔

دوسرے وجوہِ اختلاف سلہری صاحب نے تنہا معاہدۂ سویز کو ظاہری وجۂ اختلاف کی حیثیت سے پیش کیا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے وجوہ کا ان کو سرے سے علم نہیں تھا، یا علم ہوتے ہوئے انہوں نے ان سے صرفِ نظر کر لیا ہے، بہرحال اس اداریے میں کوئی دوسری چیز مذکور نہیں ہے۔ لیکن یہ بات ایک معمولی اخبار بین آدمی سے بھی مخفی نہیں کہ دو اور بڑے اختلافات کارفرما تھے۔ ان میں سے ایک اس مطالبے پر تھا کہ جو انقلاب اسلام کے نام پر اٹھایا گیا ہے اور جس میں ایک اسلامی تحریک نے بڑا پارٹ ادا کیا ہے اس سے عوام بجا طور پر یہ امیدیں لگائے بیٹھے ہیں کہ اسلامی نظامِ زندگی کی طرف۔ کسی ہلکی سے ہلکی تدریج سے سہی۔ عملی قدم اٹھنے چاہییں۔ لیکن آمریت نے نہ صرف یہ کہ اس مطالبے کو نظر انداز کیا ہے، الٹا عملی قدم اس کی مخالف سمت میں اٹھائے ہیں۔ اسلامی معاشرت کی بچی کھچی قدروں کو تلپٹ کرنے کے لیے آرٹ کے مہذب نام پر ناچ گانے کی مجلسیں منعقد کرنے اور بے حیائی و بے پردگی کی وبا کو پھیلانے نے خصوصاً غیر ملکی لوگوں کے لیے "مرشدات" (گائڈ کا کام کرنے والی بے باک لڑکیاں) فراہم کرنے کا جو نیا طوفان اٹھایا گیا اس کی طرف اخوان نے ناصر کو بار بار متوجہ کیا کہ یہ ان وعدوں سے انحراف ہے جن کے ساتھ انقلاب اٹھایا گیا تھا۔ اس پر مزاجِ یار برہم ہوا اور ہوتا چلا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ سلہری صاحب اس معاملے میں اخوان کو مذہبی تنگ نظری کا الزام دے کر آرٹ کے ان مظاہروں کو ضروری چیز قرار دیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ جس چیز کو اسلام اور اسلامی نظام۔ ہمارے نقطۂ نظر سے نہ سہی، خود آپ حضرات کے نقطۂ نظر سے۔ کہا جاتا ہو، اس کی طرف ناصری آمریت کا کوئی ایک قدم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس پورے عرصہ میں اٹھا ہوا دکھا دیجیے کہ یہ "اسلامی کارنامہ" جیب موجود تھا تو اخوان نے جلد بازی اور انتہا پسندی سے کیوں کام لیا ؟

دوسرا بڑا اختلاف جمہوریت کی بحالی کے مطالبے پر واقع ہوا ہے۔ مصری پبلک اور اخوان نے ہنگامی حالات اور فوجی آمریت کو ایک مختصر ترین عرصے کے لیے اس اعلان پر قبول کیا تھا کہ فوج صرف خیانت " (CORRUPTION) کا قلع قمع کرنے کے لیے اقتدار کے ایوان میں رک گئی ہے ، ورنہ سیاسی کارفرمائی کا بکھیڑا فوج کے بس کا روگ نہیں ، ہم لوگ تو سپاہی ہیں ، جلد سے جلد اپنی بیرکوں کی طرف لوٹ جائیں گے۔ لیکن جو لوگ آمریت کے منصوبے لے کر اٹھتے ہیں ان کا راستہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے ۔ وہ ہنگامی حالات کے اعلان کے سائے میں کسی نہ کسی طرح تخت بچھا لیتے ہیں ، پھر اس کے پائے مضبوط کرتے ہیں ، اور پھر انا ولا غیری کا نعرہ لگاتے ہیں۔ فوجی حکومت نے پارٹیوں کو ختم کر کے جونہی ہنگامی حالات کی رسی دراز کرنا شروع کی ، عوام میں اضطراب پیدا ہوا۔ اسی اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے اخوان نے جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں ہم اخوان کے مرشد عام شیخ حسن الهضيبی کے اس مکتوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو موصوف نے ناصر کو لکھا تھا اور خود پاکستان کے پریس میں شائع ہو چکا ہے ۔

اس خط میں شیخ موصوف نے ناصر سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جمہوریت اور دستوری زندگی کو از سر نو قائم کر دیا جائے اس کے ساتھ دوسری یہ بات پیش کی ہے کہ جو ہنگامی قوانین ، احکام اور فیصلے نافذ کیے گئے ہیں ان کو واپس لیا جائے قیدیوں اور نظر بندوں کی بھاری تعداد کو رہا کر دیا جائے۔ نیز پریس پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں۔ لیکن ایک آمر کی نگاہ میں سب سے زیادہ شر انگیز مطالبہ یہی ہو سکتا ہے چنانچہ ناصر ایسے مطالبے پر اپنے غیظ و غضب کو کس طرح پی جاتے انہوں نے جمہوریت کا مطالبہ کرنے والوں کو اس کا جواب وہ دیا جس کی داستانوں سے آج اخبارات کے صفحے رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لیکن سلہری صاحب نے ان وجوہِ اختلاف کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ وہ صرف معاہدۂ سویز کے اختلاف کا ذکر فرما کر رہ گئے ہیں ، اور اس کے بارے میں بھی ان کی رائے یہ ہے کہ اسے اخوان نے پردۂ فریب (SMOKE SCREEN) کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس "پردۂ فریب" کے پیچھے کونسی گھناؤنی شرارت چھپی ہوئی تھی ؟ سلہری صاحب پردہ چاک کر کے اسے سامنے لے آتے ہیں۔ وہ ہے برسرِ اقتدار آنے کی تمنا ! ذرا ملاحظہ فرمائیے ان حضرات کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرزِ فکر، کہ یہ خود چاہے رائے عام کا قتلِ عام کر کے آمرِ مطلق بن بیٹھیں اور پھر اقتدار کو ہمیشہ کے لیے اپنی جاگیر بنالیں یہ ان کا مانا ہوا اہلِ استحقاق ہے، لیکن ان سے اختلاف کرنے والے لوگ کسی بہتر سے بہتر نصب العین کے لیے سو فیصدی جمہوری طریقوں سے بھی اگر ملکی معاملات میں دخیل ہونا چاہیں تو ان لوگوں کے حق میں یہ ایک ایسی گھناؤنی ہوس اور شرارت ہو جاتی ہے کہ جسے فریب کے پردوں میں لپیٹے بغیر کہیں رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ مگر بات اتنی ہی نہیں سلہری صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ ھضیبی صاحب کے اندر تنہا خود سب کچھ ہونے (TO BE ALL IN ALL) کی حرص کارفرما تھی اور وہ اصل واحد طاقت (THE REAL AND ONLY POWER) بننا چاہتے تھے۔
قطع نظر اس سوال سے کہ جس منطق کے رو سے آپ کرنل جمال ناصر کے لیے تنہا سب کچھ بننے کا جواز نکال کے دیتے ہیں وہ ھضیبی کو اس کا حق کیوں نہیں دیتی، ہم دوسری طرف جانا چاہتے ہیں۔ ہمارا سوال صرف یہ ہے کہ ایک منظم طاقت جو ایک انقلاب میں میجر پارٹ ادا کرتی ہے، کیا دورانِ انقلاب اور اس کے فوراً بعد اس کا کوئی موقع نہیں رکھتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اہم مناصب پر اپنے آدمی ڈالتی اور پھر آہستہ آہستہ سب کچھ (ALL IN ALL) بننے کے لیے پاؤں پھیلاتی چلی جاتی؟ ہوسِ اقتدار کی ہوا جن ذہنوں میں بھری ہوتی ہے۔ ان کا نقشۂ کار یہ نہیں ہوتا کہ پہلے وہ ایوانِ اقتدار سارے کا سارا دوسروں کے حوالے کر دیں اور پھر پردہ ہائے فریب میں اپنی ہوسِ اقتدار کو چھپائے کبھی اس دروازے سے جھانکیں، کبھی اس کھڑکی سے دیکھیں کہ کدھر سے راستہ ملتا ہے اور دوسروں کو آمر بنا لینے کے بعد پھر ان سے اختلاف کی لڑائی لڑیں۔ الٹا اخوان کی پوزیشن اس معاملے میں اتنی زیادہ "منفیانہ" ہے کہ اس وجہ سے طاقت کی باگ ڈور بالکل غلط ہاتھوں میں چلی گئی۔

اخوان کا یہ جرم متعین کر لینے کے بعد کہ وہ برسرِ اقتدار آنا چاہتے اور سب کچھ تنہا وہ خود بننا چاہتے تھے، اب سلہری صاحب ان کی طرف سے مسلح بغاوت اور ملک کو تباہی اور انتشار کے حوالے کر دینے کے ہولناک خطرات ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ان ہولناک خطرات کو مصری آمریت کی دی ہوئی یہ خبر خود بخود ٹھوس بنا دیتی ہے کہ اخوان کے قبضے سے اسلحہ کے ذخائر برآمد ہوئے ہیں۔ گویا اب اخوان کے خلاف فردِ قرار دادِ جرم مکمل ہو گئی جس طاقت کے خلاف یہ فردِ قرار دادِ جرم عائد ہو جائے اس کے ساتھ آخر بجز اس کے اور کیا سلوک روا رکھا جا سکتا ہے جو ناصری آمریت نے روا رکھا ہے۔ یہ ہے سلہری صاحب کی بحث کا خلاصہ! ہم صرف اتنا دریافت کرتے ہیں کہ اگر یہ فرد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرار دادِ جرم سو فیصدی برحق تھی تو اس میں کیا امر مانع ہوا کہ اخوان کا معاملہ سول عدلیہ کے حوالے کرنے کے بجائے خود حکمرانوں نے قاضی بن کر فوجی عدالت میں طلب کیا؟ کیا دلیل جواز ہے اس بات کے لیے کہ سرسری سماعت کر کے سنگین سزائیں سنا دی گئیں اور نافذ کر دی گئیں؟ لیکن ناصری آمریت سلہری صاحب کی نگاہوں میں اتنی معصوم ہے کہ وہ اس کے کسی اقدام سے بھی تعرض نہیں فرماتے۔

ایک اہم سوال | اس بحث کو خاتمے تک لاتے لاتے ہمارے فاضل صحافی دوست نے ایک اہم سوال اٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب فوجی حکومت اخوان کے زیر ہدایت کام کرنے (TO BE GUIDED BY BROTHERHOOD) پر تیار تھی تو کونسا مانع تھا کہ وہ اس کے ساتھ تعاون نہ کرسکے؟ سلہری صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس کا جواب دے دیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس طرح کے انتہا پسند اور زعمِ صالحیت رکھنے والے (SELF RIGHTIOUS) لوگوں کی یہ ایک مستقل کمزوری ہوتی ہے کہ وہ اعتدال اختیار کرنے، حالات کے نقشے میں اپنی جگہ پیدا کرنے اور دوسروں سے سازگاری کرنے کی خوبی سے محروم ہوتے ہیں۔

ایک تو اس معاملے میں یہ بات دریافت طلب ہے کہ کن دلائل و شواہد سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ فوجی حکومت اخوان کو پیرو مرشد بنا کر کام کرنے پر آمادہ تھی لیکن جزوی سے جزوی معاملات میں فوجی حکومت نے اخوان کے نقطۂ نظر کے مطابق کوئی کام کیا؟ اور تو اور جو لوگ یہ تک نہ مان سکے کہ بغیر اسلام کا نام لیے، اور بغیر اسلامی حکومت قائم ہونے کا اعلان کیے (کیونکہ اس سے بین الاقوامی طاقتوں کے بگڑ جانے کا خطرہ تھا) کچھ نہ کچھ اصلاحات و تغیرات اسلام کے منشا کے مطابق بھی کر دئے جائیں، اور جو لوگ کہ جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں کسی ادنےٰ درجے میں کوئی تدریجی قدم تک اٹھانے پر تیار نہ ہوئے ان کے بارے میں سلہری صاحب یہ دلچسپ انکشاف فرماتے ہیں کہ وہ اخوان کی زیر ہدایت کام کرنے کو بخوشی آمادہ تھے۔ اخوان کا اپنا قصور ہے کہ ایسے لوگوں کا تعاون انہوں نے خود ہاتھ سے کھو دیا۔ دوسرے ہم اس پہلو سے بھی معلومات کے محتاج ہیں کہ اب تک جو حالات سامنے آچکے ہیں ان کے اندر اخوان کے کن کن اقدامات یا مطالبات سے انتہا پسندی اور زعمِ صالحیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے؟

علاوہ بریں ہم اسی سوال کو اگر الٹ کر دوسرے فریق پر وارد کریں کہ وہ اخوان جو جہادِ فلسطین کے زمانے سے فوجی عناصر کے ساتھ دوستی اور رفاقت رکھتے تھے، جنہوں نے جانوں کی بازی کھیل کر انقلاب کے لیے راستہ صاف کیا اور جو خود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انقلاب کے سپاہی بن کر میدان میں کام کرتے رہے، آخر کون سے اسباب کے تحت فوجی آمریت نے ایسے اچھے ساتھیوں کا تعاون کھو دیا اور کیوں نہ وہ ان کے ساتھ سازگاری پیدا کر سکی ؟ ایک اتنی عظیم طاقت جس سے آئندہ مصر کی تعمیر و ترقی میں بہت بڑے کام لیے جاسکتے تھے۔ کونسی رکاوٹ پیدا ہوئی کہ فوجی اکابران کو باقی رکھ کر ان سے مزید کام لینے کے بجائے اُن سے بگڑ بیٹھے اور ان کو موت کے گھاٹ اتارنے پر تُل گئے۔ معلوم نہیں سلہری صاحب مصری آمریت کی طرف سے کیا جواب اس کا دیں، ہمارا جواب یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں ڈکٹیٹر شپ جب بھی ابھری ہے ڈکٹیٹر شپ میں دوسروں سے سازگاری (COMPROMISE) پیدا کرنے کے لیے کبھی بھی لچک نہیں پائی گئی۔ دیکھ لیجیے اٹھا کے فراعنۂ قدیم کی تاریخ، پھر ملاحظہ فرمایئے ہٹلر اور مسولینی کے کردار کو، اور پھر جائزہ لے لیجیے روس کے کمیونسٹ انقلابیوں کے کارناموں کا! پھر خصوصیت سے مسلمانوں کے اندر سے "تیرہ سو سال پرانے دین" اور اس دین کو ماننے والے "ملاؤں" کے خلاف "جوشِ جہاد" لے کر اگر کوئی آمر اٹھا ہو تو وہ مصطفیٰ کمال سے ورے ورے کہیں تھم نہیں سکتا۔ ترکیہ کے کمال کو مصر کے جمال نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

جمال ناصر اور اس کی انقلابی کونسل میں اتنی لچک موجود نہیں تھی کہ وہ کسی ادنیٰ درجے میں بھی اسلامی نصب العین کی طرف کوئی ایک دو چار قدم اٹھا کر رائے عام کو راضی کر سکتی، وہ جمہوریت کی قدروں کے بجھے ہوئے دیوں میں سے کسی ایک آدھ ہی کو اخوان کے مطالبے پر ٹمٹمانے کا موقع دے سکتی، اور معاہدۂ سویز کو کچھ اور بہتر بنانے اور عوام کو اس کے لیے اعتماد میں لینے کی خاطر تھوڑا سا التوا ہی پیدا کر دیتی! چنانچہ سلہری صاحب کے بقول جو جتھا راج بالکل اخوان کی ہدایت اور رہنمائی میں کام کرنے پر تیار تھا اُس نے ایک ہی جست ایسی لگائی کہ پھر وہ اخوان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یا وہ انتہا تھی، یا یہ آخری حد! ایسے لوگوں کے ساتھ آخر کون سازگاری پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

اس موقع پر بسبیلِ تذکرہ خود پاکستان کے فرماں رواؤں کے بارے میں بھی سلہری صاحب سے یہ دریافت کیا جاسکتا ہے کہ گذشتہ سات برس میں تعاون کی بار بار کی پیشکشوں اور کوششوں کے باوجود کبھی کوئی ایک مثال بھی ایسی سامنے آئی ہے کہ تحریکِ اسلامی، جماعتِ اسلامی، ملک کے باشعور دینی عناصر اور اسلامی نظام چاہنے والے عوام کا اعتماد اور عملی تعاون حاصل کرنے کی کوشش ان حضرات نے کی ہو ؟ کسی معاملے میں انہوں نے دینی عناصر کے کسی بھی کام کو سراہا ہو ؟ کسی ملکی مسئلے میں ان سے مشورہ لینے کی ضرورت سمجھی ہو ؟ کبھی ان سے اپنے آپ کو قریب تر لانے کے لیے اپنے فیصلوں اور رجحانات میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی ڈھیل پیدا کی ہو؟ کبھی ان کو کوئی اہمیت دی ہو؟ ــــ کچھ بھی نہیں! شروع سے آج تک برابر حکمراں طبقے نے دینی عناصر کے سامنے اپنے آپ کو ایک آہنی دیوار میں محفوظ کر کے رکھا ہے۔ اب کل کوئی اخبار نویس ان دینی عناصر کی فردِ قراردادِ جرم مرتب کرتے ہوئے اگر ان کو انتہا پسند، حالات سے سازگاری پیدا نہ کرسکنے والے، سب کچھ تنہا خود ہی بننے کے حریص اور زعمِ صالحیت میں مبتلا قرار دے کر ان کا یہ تصور دنیا پر ثابت کرتا نظر آئے کہ انہوں نے حکمراں طبقے سے کبھی تعاون کر کے نہیں دیا، تو کون اس اخبار نویس کا قلم پکڑ سکے گا۔

اصل واقعہ بالکل نمایاں شکل میں یوں ہے کہ اخوان جیسی محبِ دین و وطن طاقت کے تعاون کو مصری آمریت نے خود ہی اپنی انتہا پسندی اور تنگ ظرفی کی وجہ سے ٹھکرا دیا ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ ہزار ہا جیتے جاگتے اور دیکھتے سنتے انسانوں کے سامنے اس واقعہ کی بالکل الٹی تصویر کھینچ کر لٹکا دی جائے۔

سلفِ صالحین کی طرف اشارہ اس موقع پر سلہری صاحب نے مسلمانوں کی گذشتہ ملّی تاریخ پر بھی ایک تنقیدی جملہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس طرح کے (سازگاری پیدا نہ کرسکنے والے) گروہ پہلے بھی بڑے خلوص کے ساتھ صالحیت کے تصورات کا دامن تھامے حکومتِ وقت کے خلاف اٹھتے رہے ہیں، لیکن ان کی مساعی کبھی بارآور نہ ہوسکیں۔ آپ کچھ سمجھے یہ تبصرہ کن لوگوں پہ ہو رہا ہے؟ یہ ذکر ہے ہماری تاریخ کی ان لامثال ہستیوں کا جن سے ہمارا ماضی جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ یہ ان عناصر کی شان بیان ہو رہی ہے جنہوں نے اگر اپنی قربانیوں سے رکاوٹ نہ ڈالی ہوتی تو ہمارے شاہانِ جبّار کے ہاتھوں حالات کا فساد اس حد تک جا پہنچا کہ اسلام کے اساسی اصول اور اس کی درجۂ اوّل کی تہذیبی و اخلاقی قدریں ملیا میٹ ہو چکتیں۔ ہاں یہ تذکرہ ہے شہدائے کربلا کا، یہ بیان ہے امام احمدؒ ابن حنبل اور امام مالکؒ کا، یہ اشارہ ہے امام ابوحنیفہؒ کی طرف، یہ انگلی اٹھائی جا رہی ہے مجدد الفِ ثانی کی ہستی کی طرف، یہ موقف بیان ہو رہا ہے سید احمدؒ شہید اور شاہ اسمٰعیلؒ شہید کا! یہ سب حکومتِ وقت کی برہمی کے علی الرغم دعوتِ حق کے چراغ اپنے خون کے روغن سے جلانے کے مجرم ہیں۔ یہ زعمِ صالحیّت سے سرشار ہو کر شاہانِ وقت کی پالیسی سے سازگاری پیدا نہ کرسکنے کے قصوروار ہیں۔ حالانکہ اصل صورتِ واقعہ بالکل برعکس رہی ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب بادشاہت کا تخت بچھ گیا تو اس پر بیٹھنے والوں میں سے اکثر کا حال یہ رہا ہے کہ وہ اختلافِ رائے کو کبھی برداشت نہیں کرسکے۔ انہوں نے دوسروں کے لیے کبھی اتنی رواداری نہیں دکھائی کہ دربار اور محل کے نظریات کے خلاف دوسروں کو اپنی بات کہنے اور سنانے کا حق حاصل رہے۔ پھر اگر کسی "سازگاری پیدا نہ کرسکنے والے" نے جرأت مندی کے ساتھ کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کلمۂ حق کہہ دیا ہے تو دلیل سے اس کا توڑ کرنے کے بجائے "تاج" نے ہمیشہ تلوار سے کام لیا ہے۔ آج تک تمام مسلمان اہلِ علم و فکر پوزیشن کو اسی طرح سمجھتے آئے ہیں اور ملت کی ہمدردیاں پوری کی پوری اعلائے کلمۂ حق کے "قصورداروں" کے ساتھ رہی ہیں۔ یہ شاید پہلا موقع ہے کہ ہمارے ایک صاحبِ قلم نے اس پوزیشن کو اُلٹ دیا ہے اور ان قصورواروں کے خلاف "تاج" کے مقدمے کی حمایت کی ہے۔

مگر سلہری صاحب اگر ذرا اور اوپر چلے جائیں اور انبیاء کی تاریخ پر بھی اسی طرح نگاہِ تنقید ڈالیں تو وہ بتائیں کہ وہ ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کے بارے میں کیا رائے دیتے ہیں؟ کون ان میں سے "قائم شدہ نظام" (ESTABLISHED ORDER) کے ساتھ سازگاری کر سکا؟ کیا نعوذ باللہ یہ سب انتہا پسند، زعمِ صالحیت میں مبتلا اور سب کچھ خود ہی بننے کے حریص لوگ تھے اور اسی قصور کی سزا انہوں نے بھگتی؟ آدمی جب ایک غلط نقطۂ نظر کو زادِ راہ بنا کر تحقیق و تبصرہ کے سفر پر چل کھڑا ہوتا ہے تو پھر وہ ایسے ایسے کنوئیں جھانکتا ہے کہ عقل کا سر چکرا جاتا ہے۔

اوپر کی اس ساری بحث سے سلہری صاحب پاکستان کے لیے درسِ عبرت اخذ کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے لئے پاکستان میں چوکنا ہو جانا ضروری ہے، کیونکہ ہم اس طرح کی گمراہ شدہ تحریکات کے خطرے سے آزاد نہیں ہیں لیکن عبرت کا یہ سبق پڑھاتے ہوئے وہ بہت سی اہم اور قیمتی باتیں بیان کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان باتوں کا جائزہ بھی لیا جائے۔

برطانوی رواداری کی مثال ہمارے فاضل صحافی دوست نے بڑے حسرت بھرے انداز میں اپیل کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ میٹھا پھل صرف ان سوسائٹیوں نے دیا ہے جن میں رواداری کی فضا قائم ہے۔ مثال کے طور پر وہ برطانوی معاشرے کو سامنے لاتے ہیں۔ جہاں مجرد خیالات کے عمل و ردِّعمل کے ذریعے اداروں میں تغیّرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔

ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس مثال کو اداریے میں پیش کرتے ہوئے سلہری صاحب نے یہ خیال بھی فرمالیا کہ مصر میں ناصر کی آمریت، یا خود پاکستان میں حکمران طبقے کی پالیسی کیا اس معیار پر کسی ادنیٰ درجے میں بھی پوری اترتی ہے؟ رواداری کی فضا بنانے میں بڑا حصہ حکمران طاقت کا ہوتا ہے جو پے در پے ایسی روایات اور ایسے نظائر قائم کرتی ہے کہ جن سے تربیت پا کر سیاسی جماعتیں اور عوام باہم دگر زیادہ سے زیادہ روادار ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے بدنصیب مسلم ممالک میں جب خود حکمران طاقتیں ہی دستوری قدروں، جمہوری روایات اور رواداری کے تقاضوں کا دن رات گلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گھونٹ رہی ہوں تو جماعتوں اور شہریوں کے سامنے برطانیہ کی مثال لا لا کے رکھنے سے فائدہ ؟ وہاں آمریت قائم ہے اور یہاں آزادی کے دستور سے محروم ایک قوم ایسے اکابر کے پنجۂ گیرا میں ہے جو جمہوریت کے نام کی نقاب اوڑھے ہوئے مستبدانہ قوانین اور ہنگامی اختیارات کے دشنہ ہائے پنہاں آستین میں لیے شہری آزادیوں پر برابر عنایات فرماتے رہتے ہیں۔ ایسے میں جماعتیں اور افراد زیادہ سے زیادہ جس نا رواداری کے مجرم ہیں وہ بس یہ ہے کہ اپنے حاکموں کی شانِ رواداری کے خلاف وہ فریاد کرتے رہتے ہیں۔ سلہری صاحب شاید یہ چاہتے ہوں کہ ان سے فریاد کا یہ حق بھی لے لیا جائے۔ کیا اس کے بعد برطانیہ جیسی رواداری کی فضا بن جائے گی ؟

اضطراباتِ پنجاب کا حوالہ | دینی عناصر کی عدم رواداری کے ثبوت میں اس موقع پر سلہری صاحب اضطراباتِ پنجاب کا تذکرہ بڑے دردناک انداز میں کرتے ہیں. بلاشبہ اس واقعہ میں کئی پہلو ایسے ہیں جن کو خود دینی عناصر میں سے بھی کوئی صحیح قرار نہ دے گا۔ لیکن اس واقعہ کے اندر سے دینی عناصر کی عدم رواداری کا ثبوت نکال کے سامنے لاتے ہوئے ایک منصف مزاج آدمی کو دوسرے فریق کا معاملہ بھی زیرِ تبصرہ لانا چاہیئے تھا۔ آپ یہ فرمائیے کہ اگر برطانیہ میں کوئی ایسا کرب انگیز معاشرتی و سیاسی مسئلہ موجود ہوتا جس کی وجہ سے باشندگانِ ملک مسلسل پچاس برس سے تڑپ رہے ہوں تو کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہاں کی حکمراں طاقت اس سے آنکھیں بند کیے پڑی رہتی ؟ اس مسئلے پر خیالات کے میدان میں اگر شور مچتا تو وہ کانوں میں روئی ٹھونس لیتی ؟ اگر اس کے بارے میں اس کے سامنے دلائل لائے جاتے تو وہ ان کا جواب دلائل سے دینے میں پہلو تہی کرتی ؟ اگر اس پر جلسوں اور قراردادوں کا طوفان اٹھتا تو وہ اسے دفعہ ۱۴۴ اور سیفٹی ایکٹ کے زور سے روکتی ؟ اگر اس پر مظاہرے ہوتے تو لاٹھیوں اور گولیوں سے جواب دیتی ؟ پھر جب اس کی اپنی کوتاہی سے معاملات اور آگے بڑھ جاتے تو وہ مارشل لاء لگا کر لوگوں کو فوجی عدالتوں سے سنگین سزائیں دلوا کر مطمئن ہو جاتی کہ اس نے رواداری کا حق ادا کر دیا ؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ سلہری صاحب ایک فریق کو تمام تر برسرِ حق اور دوسرے کو سرتاپا قصوروار ٹھہرانے کی اس پوزیشن میں رواداری کے کس اصول کے تحت اپنے آپ کو نصب کرتے ہیں۔ انہوں نے اگر ہر دو فریق کو ایک جج کی سی غیر جانبدارانہ نگاہ سے دیکھا ہوتا تو ان کا اداریہ ہر پڑھنے والے کو متاثر کر سکتا. لیکن وہ تو شروع سے آخر تک جانبدار وکیل بن کر بولے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے قیمتی خیالات کا وزن بہت کم ہو گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاکستان کا اسلامی ریاست ہونا اب فاضل مدیر اس مرکزی موضوع کو چھیڑتے ہیں جس کے گرد یہ ساری کی ساری بحثیں گھوم رہی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں اسلامی ریاست کے تصور اور ڈھانچے پر بڑی بحث و تمحیص پائی جاتی ہے وہ مانتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اسی چیز کے لیے زندگی اور موت کی بازی کھیلی ہے۔ اور اس لیے پاکستان اسلامی ریاست کے سوا اور کچھ نہیں بن سکتا۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ بالفعل صحیح معنوں میں ایک مکمل اسلامی ریاست ہے۔ دلیل؟ یہ کہ مسلمانوں اور تنہا مسلمانوں نے اسے قائم کیا ہے۔ درحقیقت کہنا یہ چاہیے تھا کہ چونکہ اسے مسلمانوں نے قائم کیا ہے لہٰذا چاہیے یہی کہ یہ ایک اسلامی ریاست ہو۔ لیکن سلہری صاحب کہتے ہیں کہ یہ ایک ٹھیک ٹھاک اسلامی ریاست ہے، کیونکہ اسے مسلمانوں نے بنایا ہے۔ مثلاً ایک کاروباری ادارے کو اگر مسلمان قائم کریں تو چاہیے یہی کہ کاروبار اسلامی خطوط پر چلے۔ لیکن اگر اس کے بجائے یہ کہا جائے کہ چونکہ ایک ادارے کو مسلمان چلا رہے ہیں، لہٰذا چاہیے وہ شراب ہی کا کاروبار کیوں نہ کر رہا ہو اور جھوٹ اور فریب کے ہتھکنڈوں سے کیوں نہ نفع کمایا جا رہا ہو، وہ بالفعل اسلامی ہے۔ تو یہ بات بالکل مضحکہ انگیز سی ہوگی۔ مسلمانوں کے ہاتھوں بادشاہت کی ذلیل ترین صورتیں قائم ہوئی ہیں۔ آج وہ آمریت چلا رہے ہیں، کہیں وہ مادہ پرستانہ جمہوری نظاموں کو لے کے چل سکتے ہیں۔ روسی ترکستان میں کمیونسٹ حکومت چل رہی ہے اور اس کے بے شمار پرزے خود مسلمان ہیں، کیا ان ساری صورتوں میں نظام کو ہم اسلامی سمجھیں گے اور اس کے تمام وظائف اور اقدامات کو مطابقِ اسلام قرار دیں گے؟ پہلے فارمولا متعین کیجیے۔ وہ یا تو یوں ہوگا کہ مسلمان جو کچھ کریں اسلامی ہے، یا یوں ہوگا کہ جو کچھ اسلام کے مطابق کیا جائے وہ اسلامی ہوگا۔ افسوس ہے کہ سلہری صاحب نے پہلا فارمولا اختیار کیا ہے جو صریحاً باطل ہے۔ تاہم وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے اس وسیع تصور کے دائرے میں کوئی بحث و اختلاف نہیں۔ بحث و اختلاف نسبتاً چھوٹے دائرے میں ہے۔ یعنی نظریاتی، ذہنی اور دستوری دائرے میں اختلافی بحثیں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں آکر معاملہ اپنی اپنی رائے کا ہو جاتا ہے۔ اسلام میں کوئی کلیسائی ادارہ (CHURCH) نہیں اور نہ کسی مذہبی طبقے کی کوئی حیثیت ہے کہ وہ اپنی رائے عام لوگوں پر ٹھونس دے!

کسی مودودی کا حقِ رائے دہی اداریہ کے اس حصے میں جیسے ایک چھالا پھٹ رہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مشکل یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ کوئی مودودی یہاں اور کوئی احتشام الحق وہاں سے ادعا کرتا ہے کہ اُن کے رائے کوئی ایسی ذاتی سند رکھتی ہے کہ لوگوں کو چپ چاپ اس کے آگے جھک جانا چاہیے۔ مولانا احتشام الحق کی طرف سے تو ہمیں بولنے کا اتنا زیادہ حق حاصل نہیں البتہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مودودی صاحب کے بارے میں اتنا ضرور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ مولانا مودودی نے گذشتہ ۱۲، ۱۵ برس میں کوئی پیری مریدی کا سلسلہ تو نہیں چلایا ہے کہ لوگوں سے آنکھیں بند کر کے اپنے ہاتھ پر بیعت کرنے کا مطالبہ کیا ہو۔ انھوں نے کرامات اور شعبدے دکھا کر تو دنیا کو مسخر نہیں کیا! انھوں نے سیفٹی ایکٹ کا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر تو دنیا کو مجبور نہیں کیا کہ مجھے اتھارٹی مانو! انھوں نے دوسروں کی زبان بندی اور قلم بندی کے احکام تو نہیں جاری کرائے! انھوں نے اختلاف کرنے والوں کو پھانسی اور قید بامشقت کی سزائیں تو کبھی نہیں دیں! مولانا مودودی نے ۱۹۳۲ء سے لے کر آج تک دلیل[1] سے اپنی بات پیش کی ہے، انھوں نے نشرو اشاعت کے ذرائع سے کام لیا ہے، علمی مجالس میں خطاب کئے ہیں، جلسہ ہائے عام میں تقریریں کی ہیں، وکلاء کی انجمنوں میں بیٹھ کر مذاکرات کئے ہیں، لوگوں کے سوالات اور اعتراضات کے جواب دئے ہیں، گالیاں کھائی ہیں الزامات کے حملے سہے ہیں اور رائے عام کے میدان کا ایک ایک انچ حصہ دلیل کے معرکے لڑ کر فتح کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ بہت سے مدارسِ فکر موجود ہیں کہ جن کو باہم دگر اختلاف ہے تو کیوں کسی ایک کی بات مانی جائے جب کہ اس کے لیے کوئی اسلامی سند موجود نہ ہو۔ اس کے جواب میں قابلِ عمل صورت وہی ہے جیسے آپ خود اس اداریے میں پیش فرما رہے ہیں کہ جس کے پاس کوئی نظریہ و فکر ہو، وہ اسے لے کر رائے عام کے میدان میں آئے، اپنے دلائل پیش کرے، لوگوں کو مطمئن کرے اور پھر جس چیز پر اکثریت مطمئن ہو کہ اسلامی ریاست کا یہی تصور وہ پسند کرتی ہے وہ جمہوری اصول پر نافذ ہو جائے یہی راستہ مولانا مودودی نے اختیار کیا ہے۔ اس پر وجہ تکدر کیا ہے! آخر آپ بتائیے تو سہی تو کس مودودی اور کس احتشام الحق نے آپ سے یہ حق سلب کر لیا ہے کہ آپ اپنے تصورات کو نہ لائیں اور ان کے لیے دلائل دے کر عوام کو ساتھ نہ لیں۔ اگر کسی کا یہ جرم ثابت ہو جائے تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہو کر کہیں گے کہ اسے ضرور پھانسی دے دی جائے۔

لیکن اندازِ گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلہری صاحب چاہتے یہ ہیں کہ کسی مودودی اور کسی احتشام الحق کو سرے سے اپنے نظریہ و تصور کو پیش ہی کرنے کا حق نہ ہونا چاہیے، اور اگر یہ حق ہو بھی تو ان کو اپنی بات ایسے قوی دلائل اور ایسے موثر انداز سے ہرگز نہ پیش کرنی چاہیے کہ مسابقتِ استدلال میں وہ بازی جیت بھی جائیں۔ وہ اگر بازی جیت جائیں تو ان پر یہ الزام

---

[1] اس کی ایک مثال "قادیانی مسئلہ" نامی پمفلٹ ہے۔ مولانا نے اس میں مسئلہ کے مختلف پہلو دلائل کے ساتھ پیش کر کے یہ چاہا تھا کہ اگر ان کے خلاف کسی کے پاس دلائل ہوں تو وہ ضرور پیش کئے جائیں۔ لیکن دلائل کا جواب دلائل سے نہیں۔ کورٹ مارشل سے دیا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دکھا جائے کہ تم حکمانہ اتھارٹی کے ساتھ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہو۔

سلہری صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ نظریات و تصورات کے انتخاب کا حق عوام کو ہونا چاہیئے۔ ضرور ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے عوام کے اسی حق کو سامنے رکھ کر اسلامی دستور اور اسلامی نظام کے تصورات ہمیشہ عوام تک پہنچائے ہیں اور جو مطالبہ بھی پیدا ہوا ہے عوام ہی کے اندر سے پیدا ہوا ہے۔ پھر اداریہ میں لکھا گیا ہے کہ پارلیمنٹری ادارات عوام کے اجتماعی تصورِ اسلام کے اظہار کا مناسب ترین ذریعہ ہیں۔ اور اسی ذریعہ سے کسی چیز کو نافذ ہونا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مودودی صاحب یا جماعتِ اسلامی نے کوئی مسلح بغاوت کرا کے یا کسی با اختیار فرد کے سر پر پستول رکھ کر کوئی بات آج تک منوائی ہے اور کبھی پارلیمنٹری راستے سے ہٹ کر اپنے دستوری تصورات کو ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے؟ اب تک اس سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے انھی پارلیمنٹری ادارت کے ذریعے ہوا ہے۔ قراردادِ مقاصد اسی ذریعے سے پاس ہوئی تھی، رہنما اصول اسی طریقے سے طے پائے تھے اور مسودۂ دستور نے ایک خاص شکل اسی طریقے سے اختیار کی تھی۔ لیکن دوسری طرف سے اس دوران میں قدم قدم پر رائے عام کو دبانے اور اس سے انحراف کرنے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے کی تدبیریں لڑائی جاتی ہیں۔ آخر میں جب ان تدبیروں کے علی الرغم کسی نہ کسی حد تک اسلامی خطوط پر دستور سازی کا کام تکمیل کو آ پہنچا تو سرے سے دستور ساز کا وجود ہی ختم کرنے کی کوشش کر ڈالی گئی۔

ایک ایک حرف جو سلہری صاحب نے لکھا ہے کہ یہ ہونا چاہیئے اور یہ نہ ہونا چاہیئے، وہ ٹھیک اسی موقف کی تصویر پیش کرتا ہے جسے جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آسکا کہ پھر اعتراض کس چیز پر ہو رہا ہے اور درسِ عبرت کس معاملے میں دیا جا رہا ہے؟

ہاں آخر میں یہ بھی پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ جن عوام کو سلہری صاحب بار بار فائنل اتھارٹی اور فیصلہ کن طاقت قرار دے رہے ہیں، ان کی اتھارٹی اور ان کے اختیار کی کیا گت گذشتہ سات برس میں بنتی رہی ہے اور آج کیا بن رہی ہے۔ عوام کو کب کسی نے پوچھا ہے کہ تم کون ہو، کہاں رہتے ہو، کس طرح سوچتے ہو، کیا چاہتے ہو؟ مسلم لیگ کا تعلق پاکستان بنتے ہی عوام سے کٹ چکا حکمران طبقے کا حال یہ ہے کہ وہ پہروں میں چلتا ہے اور ریڈیو پر سے وعظ کہہ دیتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہمارے اکابر کسی مسئلے کو لے کر میدان میں آئیں، لوگوں کی آنکھوں سے آنکھ ملا کر بات کریں، اپنے دلائل دیں اور ان کے دلائل سنیں، معلوم کریں کہ ان کے مسائل اور مطالبات کیا ہیں، وہ کیسا نظامِ زندگی چاہتے ہیں اور وہ کن تبدیلیوں کے لیے بےچین ہیں؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتنا ہی نہیں کہ عوام سے قریب ہو کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں سنی نہیں جاتیں، الٹا یہ ہوتا ہے کہ عوام کسی مسئلے پر جب مطالبات لے کر اٹھتے ہیں اور ان کے اضطراب کی لہریں ملک کے گوشے گوشے سے آ آ کر ایوانِ اقتدار سے ٹکراتی ہیں تو ایوان کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں۔ کیا سلہری صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ دستور کے مسئلے پر پوری قوم نے یک آہنگی سے پچھلے سات سالوں میں کیا تمنائیں دستور یہ اور حکمران پارٹی کے سامنے رکھی ہیں؟ کیا سلہری صاحب ناواقف ہیں کہ مارشل لاء کے اسیروں کے بارے میں ملک کی کوئی تنظیم اور کوئی بستی ایسی نہیں رہی جس کی طرف سے صریح بے انصافی کے ازالہ کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو؟ پھر ان اصل اتھارٹی اور اختیار رکھنے والے عوام کو کیا جواب ملا؟

اب تو عوام کے متعلق ذمہ دار ترین لوگوں کی طرف سے کھلم کھلا یہ کہا جانے لگا ہے کہ یہ جمہوریت کے اہل نہیں، معاملات کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے، مذہبی رو میں بہہ جاتے ہیں اور بہکانے والوں کے ہاتھوں میں کھیل جاتے ہیں جن عوام کو یہ سنہرا سرٹیفکیٹ دیا جا رہا ہو، ان بچاروں پر فائنل اتھارٹی ہونے کا الزام بہت ہی بڑی زیادتی ہے۔ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔ چاہتے ہیں جو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔ یہ اگر آپ لوگوں کی ہر بات پر ایمان لے آیا کریں تب تو یہ فائنل اتھارٹی ہونے کے حق دار ہوں بھی، لیکن جب یہ اپنے مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں اور کوئی صدائے اختلاف بلند کر دیں تو پھر یہ جمہوریت سے نوازے جانے کے مستحق ہی نہیں رہتے۔

فی الواقع اگر آپ لوگ عوام کو آخری فیصلہ کن طاقت قرار دیتے ہیں تو آئیے، آج آئیے اور اپنے نظریات و تصورات کو آپ ان کے سامنے رکھ دیجیے اور دوسری طرف تمام دوسرے لوگوں کو موقع دیجیے کہ وہ بھی اپنے اپنے نظریات و تصورات پیش کر دیں۔ ایک کھلے کھلے استصواب رائے کے ذریعے فیصلہ کرا لیجیے کہ آخری فیصلہ کن طاقت کس کو قبول کرتی ہے اور کسے رد کرتی ہے۔

(۳)

اب بحث کا تیسرا حصہ سامنے آتا ہے اور اصل نتیجہ برآمد ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ جو سبق سلہری صاحب پاکستان کو دینا چاہتے ہیں وہ اس حصے میں دیا جا رہا ہے۔ اس نتیجے یا سبق کے دو جز ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کے نام پر سیاست کے میدان میں کسی کو کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی کے نظریات دوسروں پر ٹھونسے نہ جائیں۔ بحث کے حصے میں بھی ان دو نکات کو پیش کرتے ہوئے ایسی باتیں کہی گئی ہیں کہ جن کا ناقدانہ جائزہ لینا مفید ہوگا۔

سیاسی تنظیمیں اسلامی نہ ہونی چاہئیں | سلہری صاحب بتاتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کو باہم دگر اختلاف و تنقید سے کام لینا پڑتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس بنا پر بسا اوقات برا بھلا کہنا پڑتا ہے۔ مثلاً انگلستان کے ٹوری سوشلسٹوں کو انتشار پسند (ANARCHIC) اور نظم دشمن قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف سے پلٹ کر اعتدال پسندوں (CONSERVATIVES) کو خون چوسنے والے سرمایہ دار کہا جاتا ہے۔ اب بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ایک سیاسی تنظیم اسلام کی علمبردار بن کے اٹھے، مثلاً جماعت اسلامی تو وہ اپنے مخالفین کو کیا کہے گی؟ جس گالم گلوچ سے یہ اپنے دائرے سے باہر کے لوگوں کی تواضع کرسکتی ہے وہ کافر اور ملحد کہنے کے علاوہ اور کیا ہوگی! یہ پیچیدہ مسئلہ پیش کرتے ہوئے سلہری صاحب اس کے عملی ثبوت کے طور پر یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی آئے دن اختلاف کرنے والوں کے لیے یہی کلمات استعمال کرتی رہتی ہے، چنانچہ مسودۂ دستور میں ترمیم چاہنے والوں کے خلاف اس کے ترجمان نے ٹھیک یہی انداز اختیار کیا تھا۔

پہلے اس عملی ثبوت کے بارے میں بات کرلینا ضروری ہے۔ مارچ ۵۳ء میں مسودۂ دستور میں ترمیم کرانے کے لیے نہیں بلکہ دستور یہ توڑ دو کا مشہور نعرہ متحدہ محاذ کی طرف سے اٹھا تھا۔ اس نعرے کے بارے میں خود مسلم لیگی اور سرکاری اور قوم پرست حلقوں نے بھی تاثر دیا تھا کہ یہ کچھ کمیونسٹوں، تخریب پسندوں، مفاد پرستوں اور اسلامی دستور کے مخالفوں کا اٹھایا ہوا نعرہ ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کمیونسٹ اور اسلامی دستور سے چڑنے والے عناصر جہاں جہاں بھی تھے انھوں نے اس کی تائید میں پورا زور صرف کیا تھا۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے ایک قرارداد میں اس تخریبی نعرہ کی تردید کرتے ہوئے اس کے علمبردار عناصر کو محض ایک واقعہ ہونے کی حیثیت سے پیش کردیا تھا کہ یہ آواز کیسے لوگوں کی ہے۔ درحقیقت اس انتباہ کا مقصود صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے اٹھائے ہوئے نعرے کی گہرائیاں عام لوگ سمجھیں اور کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، نہ یہ کہ جو کوئی بھی اخلاص یا غلط فہمی کے تحت اسے اختیار کرتا جائے۔ اس پر ایک مذہبی گالی چسپاں ہوتی چلی جائے۔ دوبارہ یہی نعرہ اکتوبر میں اٹھا تو پھر اس کی پہلی "ہُو" انھی صفوں سے بلند ہوئی جن کو مارچ سے لوگ جانتے تھے۔ اب یہ تو "اسرار درون پردہ" کا معاملہ تھا کہ اقتدار کے لیے کشمکش کرنے والے دو دھڑوں میں سے ایک نے اندر ہی اندر اس ردّ شدہ نعرے سے کوئی مفید کام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اب اس نعرے کے جھنڈے تلے بڑے بڑے حضرات کا جو انبوہ جمع ہوگیا تھا ان میں سے ہر ایک خواہ مخواہ ان الفاظ کو اپنے اوپر اوڑھ کر مظلومی کی شان سے سامنے آتا ہے کہ دیکھیے جماعت اسلامی والے اپنے سوا دوسروں کو ملحد اور کمیونسٹ کہتے ہیں۔ بھائی کسے معلوم تھا کہ آپ جیسے اسلام نواز حضرات بھی اب اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے جیسے گاڑنے والوں نے جب گاڑا تھا تو خود آپ ہی کی صفوں سے ان کو کمیونسٹ اور ملحد کہا گیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب لیجیے، جماعت اسلامی کی روش کو۔ جماعت کا طریقہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مجرد اختلاف کرنے کی بنیاد پر کسی بھی مومن کو کافر یا ملحد یا کچھ اور کہے۔ وہ اپنے آپ سے ہر فرد بشر کو اختلاف کا کھلا حق دیتی ہے، اور دوسروں کے مقابلے میں یہی حق اپنے لیے چاہتی ہے۔ اختلاف جیسا کسی سے ہوتا ہے، اسی کے مطابق وہ اس کی فکری پوزیشن کو بیان کر دیتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی جمہوریت کے کسی اصول سے انحراف کرتا ہے تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ جمہوریت کی مخالفت ہے۔ قانون وعدل کے صریح تقاضوں سے کوئی روگردانی کرتا ہے تو وہ فقط یہی کہتی ہے کہ یہ انصاف اور قانون کا عدمِ احترام ہے۔ کوئی معاشی دائرے میں استحصال کرتا ہے تو وہ یہ کہتی ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ اطوار ہیں۔ نہ یہ کہ وہ ہر اختلاف کر دوسروں کو کافر اور ملحد کہہ ڈالتی ہو۔ پھر جہاں تک تکفیر کے الزام کا تعلق ہے، اس سے جماعت کا دامن قطعاً پاک ہے۔ "ملحد" اور "کمیونسٹ" کے الفاظ البتہ ایسے ہیں جو اپنے ناگزیر موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ الحاد اس کو کہتے ہیں کہ اسلام کو مانتے ہوئے آدمی اس میں ٹیڑھ نکالے اور انحراف کی کھلی کھلی صورتیں اختیار کرے۔ اب سلہری صاحب اپنے معاشرے کو سامنے رکھ کر بتائیں کہ کیا یہاں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ ایسے بے شمار افراد موجود نہیں ہیں جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، اسلامی نظام کو ڈھکوسلہ سمجھتے ہیں، اسلام کے دستوری تصورات پر پھبتیاں کستے ہیں، اس کے عملی تقاضوں سے فرار کرتے ہیں اور اس کے اجتماعی مطالبات کو رد کرتے ہیں؟ اگر سلہری صاحب چاہیں تو ہم نام لے کر ان ممتاز ہستیوں کا تعارف کرادیں جو پاکستان کے اسلامی ریاست قرار پانے کی صورت میں شرم کے مارے اپنی گردن دنیا کے سامنے اٹھانے کے قابل نہیں رہتے، جو قراردادِ مقاصد کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھنے والے ہیں کہ جیسے پاکستان کے دامنِ عزت پر کوئی گھناؤنا دھبہ لگ گیا ہے، حتیٰ کہ حال یہ تھا مسودۂ دستور میں ریاست کے تسمیہ (NOMENCLATURE) کی دفعہ نے جب پاکستان کا نام "جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان" تجویز کر دیا تو وہ پیچ و تاب کھاتے رہ گئے۔ آخر جب یہ عنصر ہمارے ہاں موجود ہے اور جب کمیونسٹوں کی ایک تعداد یہاں کام کر رہی ہے تو کوئی بھی کام کرنے والی جماعت ان کے موجود ہونے سے کیسے آنکھیں بند کر سکتی ہے اور کیسے ان کی حرکات سے چشم پوشی کر سکتی ہے۔ یہ عناصر اگر کوئی اقدام اپنے نظریات کے مطابق کریں گے تو اس کام کو انھی سے منسوب کیا جائے گا، نہ یہ کہ ملحد اور کمیونسٹ عناصر کے کارناموں کو جمعیت العلماء اور مسلم لیگ کے نام سے بیان کیا جائے۔ ان عناصر کے لیے آخر آپ کونسا نام تجویز کر کے دیتے ہیں کہ اس سے ان کو موسوم کر کے بات کی جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل الجھن جس وجہ سے پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر طرزِ فکر اور ہر مسلک کے لوگ اپنے آپ کو جرأت کے ساتھ ایسے نام سے پیش کرتے اور ایسے نام سے موسوم ہونا چاہتے ہیں جو ان کے طرزِ فکر اور مسلک کو ظاہر کرتا ہو۔ لیکن ہماری صفوں میں ملحد اور کمیونسٹ، دونوں ہی عنصر یہ عجیب پوزیشن اختیار کر کے رہنا چاہتے ہیں کہ وہ خیالات، طرزِ عمل اور سرگرمیوں کے لحاظ سے تو الحاد اور کمیونزم کے علمبردار ہیں لیکن اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے اپنے آپ کو ملحد اور کمیونسٹ کے نام سے سامنے نہیں لاتے۔ اب اگر کوئی دوسرا ان کے خیالات اور مسلک کے نام سے ان کا صحیح نام لے دیتا ہے تو وہ اس کے گلے پڑ جاتے ہیں کہ تم اختلاف کرنے والوں کو گالی دیتے ہو! معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک مسلم معاشرہ میں اپنا کام منافقت کی ایک نقاب ڈال کر جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اگر کوئی اس نقاب کو سرکاتا ہے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ___ اسلامی نظام کے خلاف صریح طور پر بغض رکھنے والے، اسلامی دستور کا ذکر چھڑتے ہی پسینہ پسینہ ہو جانے والے اور کتاب و سنّت کا نام آتے ہی اشتعال پذیر ہو جانے والے سب کے سب یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور طرزِ فکر کے لحاظ سے ہرگز نہ پہچانے جائیں، بلکہ اسلام کے مخلص ترین خادموں میں شمار ہوں۔ سلہری صاحب! یہ پردۂ منافقت ہے جو اصل پیچیدگی پیدا کر رہا ہے۔ یہ ہٹا دیجیے تو کوئی الجھن نہیں ہو گی۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو صاف صاف طریق سے اگر اسلامی نظام کی دعوت کے ساتھ لا رہے ہیں، تو کیوں نہ کچھ دوسرے لوگ کھلم کھلا اسلامی نظام کی مخالفت کا علم اٹھا کے میدان میں کام کریں اور کہیں کہ ہم ملحد اور کمیونسٹ ہیں، ایک مادہ پرستانہ سیکولر نظام چاہتے ہیں، ہمیں اسلام وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ یوں اگر رائے عام کے کھلے میدان میں مسابقت رہے تو بہت آسانی سے اِدھر یا اُدھر فیصلہ ہو سکتا ہے۔

"جماعت اسلامی" کا نام | بحث کا یہ پس منظر بنا چکنے کے بعد سلہری صاحب جماعت اسلامی کے نام پر اعتراض اٹھاتے ہیں اور وہ شاندار استدلال کرتے ہیں کہ آدمی عش عش کر اٹھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس نام کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے علاوہ دوسرے تمام لوگ اسلام کے دائرے سے باہر ہو گئے۔ جی ہاں! مسلم لیگ نام کی اگر ایک جماعت موجود ہو تو وہ گویا یہ کہتی ہے کہ اور جتنی بھی جماعتیں ہیں وہ مسلمانوں کی نہیں غیر مسلموں کی ہیں۔ اگر ایک جمعیت العلماء موجود ہو تو وہ گویا اپنے نام کے ذریعے یہ اعلان کرتی ہے کہ باقی سب جمعیتیں "جہلاء" کی ہیں۔ کوئی ادارہ خدمتِ خلق موجود ہو تو گویا یہ نام رکھ کر وہ دوسرے تمام اداروں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ سب خدمتِ نفس کے ادارات ہیں۔ اسلامیہ کالج اگر کوئی

© rasailojaraid.com

پایا جائے تو وہ گویا پکار پکار کر دوسرے تمام کالجوں کا غیر اسلامی ہونا واضح کرتا ہے۔ "طلوعِ اسلام" نام کا کوئی جریدہ
نکلے تو اس کا سرورق گویا دوسرے تمام جرائد کو "طلوعِ کفر" کا افق قرار دیتا ہے۔ اداروں اور جماعتوں کو چھوڑ کر اسی
دلیل سے افراد کو لیجیے تو ماننا پڑے گا کہ اگر کسی شخص نے اپنا نام غلام محمد رکھ لیا ہو تو گویا وہ دوسرے کروڑوں بھائیوں کے
بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ محمدؐ کے نہیں، کسی اور کے غلام ہیں۔ اگر کسی کا نام عبداللہ ہو تو وہ دوسروں پر بالواسطہ
طریق سے یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ عباد الشیطٰن ہیں۔ کوئی شخص اگر "سعادت" اپنا تخلص اختیار کر لے تو باقی دنیا پر نحوست کا
تخلص خواہ مخواہ چپک جائے گا۔ یہ دلیل بازاری سطح کے لوگوں سے تو پہلے بھی سنی تھی لیکن اس پر بڑی مایوسی ہوئی کہ پاکستان کا
ایک ممتاز اخبار نویس بھی اس کو ایک برہانِ قاطع بنا کے لے آیا۔ اس برہانِ قاطع کی بنیاد پر سلہری صاحب چاہتے ہیں
کہ "جماعت اسلامی" کے نام کو ممنوع (BAN) ٹھہرا دیا جائے۔ دلچسپ امر یہ کہ وہ یہ بھی اجازت مرحمت
فرماتے ہیں، بلکہ کچھ اصرار بھی کرتے ہیں کہ ہماری جماعتوں کا پروگرام اسلامی اصول و مقاصد سے مالامال ہونا چاہیے،
لیکن بس وہ "اسلامی" نہ کہلائیں، مٹھائی بنایئے، اس میں شکر ضرور ملایئے، اسے خوب میٹھا کر لیجیے لیکن اس کا نام مٹھائی
نہ رکھیے۔ بلکہ حنظل رکھیے ورنہ اگر آپ نے اپنی مٹھائی کا نام کہیں مٹھائی رکھ لیا تو آپ دوسروں کی مٹھاس کی نفی کرنے کے
مجرم بن جائیں گے۔ آپ ایلوپیتھک دواؤں کی دکان کھولیں تو اس کے بورڈ پر یہ واضح نہ کریں کہ یہاں ایلوپیتھک دوائیں
ملتی ہیں، بلکہ باہر یہ لکھیے کہ یہاں سے بھوسہ اور چارہ مل سکتا ہے۔

دنیا میں نام ہمیشہ حقیقتِ شئے کو واضح کرنے کے لیے تجویز کیا جاتا ہے۔ پارٹیوں اور جماعتوں کے نام ان کی فکر
اور ان کے پروگرام کو پیش کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں یہ لطائف کبھی نہیں پیش آئے کہ کمیونسٹ، سوشلسٹ،
جمہوری یا کسی اور نظریہ کی جماعت کو مطابقِ حقیقت ناموں سے موسوم کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہو تو آخر ایک
اسلامی نظریہ رکھنے والی تنظیموں ہی کے لیے یہ طرفہ قانون کیوں گھڑ لیا جائے۔ کب جماعتِ اسلامی نے آپ کو منع کیا ہے
کہ آپ اگر اسلامی نظریہ پر کام کرنا چاہیں تو اپنی کسی تنظیم کو اسلام سے منسوب نہ کریں۔ اسلامی نظریہ کی علمبردار اگر یہاں درجنوں
جماعتیں بھی ابھر آئیں تو وہ ایک مقصد کے خادموں کی متعاون ٹیمیں بن کر کیوں نہیں کام کر سکتیں! ہم تو سلہری صاحب کو
دعوت دیں گے کہ وہ جس تصور کے ساتھ بھی اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہوں بسم اللہ کریں اور ایک اور اسلامی جماعت کی
بنیاد ڈال دیں۔ اس میں جماعت اسلامی کا نام بے چارا کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اگر حقیقتِ شئے کو کسی لمبے ڈھنگے نام سے

© rasailojaraid.com

موسوم کر دیا جائے تو بالآخر وہ نام خود ہی اپنے معنی بدل دیتا ہے، مثلاً اگر جماعت اسلامی کا نام آپ کوہِ ہمالیہ بھی رکھ دیں گے تو خود لفظ کوہ ہمالیہ کے معنی ایک دن جماعت اسلامی ہو کے رہ جائیں گے۔

جماعتوں کو خلاف قانون قرار دینے کے معنی | لیکن اصل مدعا نام کو نہیں، بلکہ اس نام کے بہانے جماعتِ اسلامی کی تنظیم اور تحریک کو خلاف قانون قرار دلوانے کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ سلہری صاحب شوق سے یہ مہم شروع کریں لیکن وہ اپنے مرتبے کا کچھ تھوڑا بہت لحاظ کر کے یہ سوچیں کہ اس قسم کی بات زبان پر لانے کے معنی کیا ہیں۔ ایک جماعت کو خلاف قانون قرار دینا درحقیقت اس کے قتل کا معنی رکھتا ہے۔ جماعت کا قتل ایک نظریے، ایک نصب العین اور ایک پروگرام کو پھانسی دینا ہے۔ آخر وہ یہ پھانسی کس بنیاد پر کسی کو دلوانا چاہتے ہیں ــــ محض اختلافِ رائے کے گناہ پر! تو پوزیشن وہی ہوئی جیسے کسی علاقے کا کوئی جابر جاگیردار جب یہ دیکھتا ہے کہ فلاں خوددار آدمی چونکہ میرے دربار میں آ کر میری ہاں میں ہاں نہیں ملاتا اور برسرِعام مجھ سے اختلافِ رائے ظاہر کرتا ہے تو وہ پیچ و تاب کھا کر اس کے قتل کرانے کی سازش پر اتر آتا ہے۔ خود قتل نہیں کر سکتا تو کسی دوسرے کی منت سماجت کرتا ہے کہ کسی طرح یہ کانٹا نکال دو۔ سلہری صاحب غور کریں کہ اگر اسی پوزیشن کو وہ اختیار کرنے والے تھے تو آخر پورے اداریے میں جگہ جگہ آزادی رائے کا وعظ کہنے کی تُک کیا بیٹھی؟

رواداری کی ضرورت پر اتنا کچھ کہہ ڈالنے کے معنی کیا رہے؟ جمہوریت نوازی کے سارے حوصلوں کی پرواز بس اتنی ہی تھی؟

جاگتے ہوئے ضمیر کے ساتھ سوچیے کہ آخر ان یہودیوں کی کرتوت آج ہم سے کس بنا پر خراجِ نفریں وصول کرتی ہے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے لیے سولی کی سزا تجویز کی تھی؟ ان جبارانِ زمانہ کے کارناموں کو آج ہم حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہیں جنہوں نے انسانیت کے بہترین خادموں کو استبداد کے کولھو میں پیل دیا تھا؟ یورپ کے قرونِ مظلمہ کے ان تنگ دل حکام اور پادریوں کو ہم کیوں کوستے ہیں جنہوں نے گلیلیو اور نیوٹن جیسے اہلِ فکر پر جینا تنگ کر دیا؟ ہم ان یونانیوں کو کیوں کڑھن کے ساتھ یاد کرتے ہیں جنہوں نے سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیا؟ ہم ان علمائے سُو کا نام کیوں ذلت آمیز طریق سے لیتے ہیں جنہوں نے مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں بیٹھ بیٹھ کر ہر اختلاف کرنے والے کے خلاف فتوے لگائے [illegible] جس کا بس چل گیا اس کو موت یا قید خانے کے حوالے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرلئے چھوڑا؟ ان لوگوں کا گناہ صرف تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اختلاف کی برداشت اپنے اندر پیدا کرنے کے بجائے یہ پسند کیا کہ انسانیت کے جو اونچے سے اونچے خادم ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ ان لوگوں نے کلمۂ حق کہنے والوں، آزادیٔ رائے کا مظاہرہ کرنے والوں اور تنقید کی صدا بلند کرنے والوں کے خلاف طرح طرح کے بہانے تراشے، بےگانہ استدلال گھڑے، نئی سے نئی منطقیں ایجاد کرلیں، مذہب اور قانون کی حسب منشا کوئی تعبیر پیدا کرلی اور منتخب روزگار ہستیوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔

اب دیکھیے کہ یہ آپ کا طبقہ ہے کہ جس کے قبضے میں تخت و تاج ہے۔ خزانے اور ذرائع و وسائل ہیں نشر و اشاعت کی طاقتیں ہیں، ریڈیو اور پریس ہے، پشت پر واحد نمائندہ جماعت ہے، حمایت میں بے شمار دماغ ہیں، پھر استبدادی قوانین و اختیارات ہیں، پولیس اور فوج ہے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی ہے کہ جو تھوڑی سی تعداد ارکان اور ان کی جیبوں سے نکلی ہوئی محدود سی رقوم اور ایک روزنامہ اور دو چار ماہانہ اور ہفتہ وار جرائد کے بل پر ایک فکر پیش کر رہی ہے۔ اگر اس کی فکر غلط اور باطل ہے اور اس کا پروگرام مہلک ہے اور وہ واقعی نامعقول طریقوں سے کام لے رہی ہے تو آخر آپ کے اس طبقہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ رواداری کی کھلی فضا میں اتنی ہمہ گیر طاقتوں سے کام لے کر اسے شکست نہیں دیتا۔ دلیل کے میدان میں کسی جماعت یا تحریک کو شکست دے دی جائے تو پھر چاہے چند سر پھرے آدمی اس سے کتنے ہی چمٹے رہیں وہ حالات پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں رہتے اور آہستہ آہستہ فاتح خیالات کی طاقت ان کو دھکیل کر زندگی کے بعید ترین گوشوں میں بٹھا دیتی ہے۔ مگر اب کیا آپ لوگ دلیل کا میدان واقعی چھوڑ چکے ہیں کہ نوبت جماعت اسلامی کے قتل کے بہانے پیدا کرنے تک آ پہنچی ہے۔ دنیا کے جس گوشے میں آپ کا یہ اداریہ پڑھا جائے گا، اغیار پاکستان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ ہمارے معیار جمہوریت اور ہمارے ہاں کی رواداری اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے ظرف کے بارے میں لوگ کیا اندازے باندھیں گے؟

سوچیے، اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ آپ کا یہ حکمران طبقہ وہ ہے کہ جس کی طرف سے جماعت اسلامی کو پچاسوں بار غدار اور تخریب پسند کہا جا چکا ہے اور انڈیا، روس اور امریکہ میں سے ہر ایک کا روپیہ پروپیگنڈا کی حد تک کئی کئی بار دلوایا جا چکا ہے۔ ہم تو یہ سب کچھ سہتے چلے آ رہے ہیں، بلکہ اس سے اوپر یہ کہ سیفٹی ایکٹ کے وار، پھانسیوں اور قید کی سزائیں، ضبطیاں اور زبان بندیاں اور قلم بندیاں سب کچھ صبر سے بھگت رہے ہیں، لیکن دوسری طرف ایک "جماعت اسلامی" کا نام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتنی ناقابلِ برداشت چیز ہو گیا ہے کہ آپ جیسے ممتاز صحافی اسے خلاف قانون قرار دینے کے دلائل ادارتی صفحات میں پیش کرنے لگے ہیں۔ خدارا سوچیے کہ آج جو تاریخ بن رہی ہے اس میں اپنے لیے کیا مقام آپ پیدا کر رہے ہیں۔

مغرب زدہ ذہن | سلہری صاحب کی اس جرأت کی ہمارے دل میں بہت قدر پیدا ہوئی کہ آپ نے اس بات کا صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ ذہنوں پر غیر ملکی راج اور مغربی فکر و تہذیب کا گہرا اثر موجود ہے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ اور معاشرے کے تعلیم یافتہ عنصر کا اس پہلو سے ڈیفنس کرنے کے بعد فوراً آپ نے دوسری جانب جارحانہ حملہ کر دیا ہے۔ یعنی مذہبی لوگوں کو جدید علوم سے بے بہرہ اور حالات کے تقاضوں سے ناآشنا قرار دے دیا ہے۔ اس موقع پر بھلا مولانا مودودی کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مولانا احتشام الحق کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی کا نام لے کر ان کی علمی حیثیت پر استفہامِ انکاری فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس سطح پر جا نہیں سکتے کہ کسی کی جہالت اور کسی کی علمیت کا ناپ تول کر سکیں۔ علم اگر کہیں ہو گا تو اپنا اعتراف خود کرائے گا، نہیں ہو گا تو محض نام کے سکّے دیر تک نہیں چل سکتے۔ درنج ہوتا ہے کہ یہاں آ کر سلہری صاحب نے ایسی پوزیشن اختیار کی ہے کہ جیسے دو طبقوں کا کوئی طبقاتی جھگڑا ہے اور سلہری صاحب ایک طبقے کے بالمقابل دوسرے کا دفاع کر رہے ہیں۔ اگر حالات کو انہوں نے واقعی اسی طرح سمجھا ہے کہ یہ ملّا اور مسٹر کی کشمکش ہے تو قطعی طور پر غلط سمجھا ہے۔ کم سے کم جماعت اسلامی کی حد تک اگر ان کو پہلے سے معلومات نہیں ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ اس کی صفوں میں دونوں طرف کے لوگ آ کر جمع ہوئے ہیں، بلکہ جدید طبقے کے حلقوں سے نسبتاً بہت زیادہ تعداد میں لوگوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم لوگ بعض اوقات معیاری علماء کی تعداد کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ یہی بیّن ثبوت ہے، اس بات کا کہ کشمکش طبقاتی نہیں ہے، ورنہ جماعت اسلامی کے لیے جدید طبقوں کے دروازے طبقاتی تعصب نے کبھی کے بند کر دیے ہوتے۔ معاملہ درحقیقت نہایت زوردار تاریخی تقاضوں اور مستقل نظریوں کی کشمکش کا ہے جسے ہم آخر میں مختصراً واضح کریں گے۔

خیر، اسی سلسلے میں فاضل مدیر اقبال کا ذکر چھیڑتے ہیں کہ ایسے چوٹی کے لوگ تو شاذ ہی ہو سکتے ہیں جو ایک ماحول میں پرورش پا کر اور ایک نظامِ تہذیب کے تحت تعلیم حاصل کر کے اٹھیں اور پھر آزاد ذہن کے ساتھ اسی کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتے اور اس کے بالمقابل ایک نئی فکر پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیں۔ سب لوگ واقعی اس درجے کے نہیں ہو سکتے، لیکن قدرت ایسے ممتاز افراد سے قوموں کو اسی لیے نوازتی ہے کہ اوسط درجے کے دل و دماغ جو از خود ماحول اور وقت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تہذیب کے کمزور پہلوؤں کو نہیں سمجھ سکتے اور ان سے اوپر اٹھنے کے لیے کوئی فکر از خود حاصل نہیں کر سکتے، وہ خاص خاص تاریخی شخصیتوں کی فکر سے اپنے چراغ روشن کریں۔ لیکن آپ اقبال کو اٹھا کر غیر معمولی پن کے اونچے طاق میں رکھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے اپنے آپ کو ماحول اور تاریخ کے حوالے کر دیتے ہیں کہ ہر کوئی اقبال تو نہیں بن سکتا۔ بلاشبہ ہر کوئی روسو اور مانٹسکیو اور گاندھی اور محمد علی جناح نہیں بن سکتا، مگر اِن سے فکر و عمل کا درس تو لے سکتا ہے۔

اقبال مرحوم کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ملّتِ اسلامیہ کے اُس دوگونہ تاریخی ردِّ عمل کو سمجھ کر اپنے کلام میں جذب کر لیا جو گذشتہ ایک صدی سے مغرب کے سیاسی و تہذیبی غلبے کے تحت پروان چڑھا۔ ایک طرف اُس نے دورِ جدید کے مطالعہ سے علم و عمل کے میدانوں میں ترقی کرنے، حالات سے کشمکش کرنے، قوتوں کو مسخر کرنے، جدید ذرائع و وسائل سے کام لینے اور جدید ادارات سے استفادہ کرنے کا وہ سبق لیا جو خود اسلام کا پڑھایا ہوا سبق تھا۔ دوسری طرف اُس نے نظامِ حیات کی بنیاد بنانے کے لیے مغرب کی مرعوبیت سے بالاتر ہو کر اسلامی اصولِ فکر کو بغیر کسی ندامت و معذرت کے اپنایا۔ یہ دونوں تاریخی رجحانات خود ملّت اسلامیہ کے اندر مغربی غلبے کے ردِّ عمل سے پیدا ہو کر نمایاں ہو رہے تھے مگر دھندلے اور نیم شعوری تھے۔ اقبال نے ان کو اجاگر کر دیا اور اس طرح اس کے کلام نے تعمیرِ نو کے لیے ایک صحیح راستے کی نشان دہی کر دی۔ اس لحاظ سے اقبال کو دیکھیں تو وہ ہمارے قدیم مذہبی طبقے اور جدید روشن دماغ طبقے کے درمیان ایک ایسے وسطی مقام پر کھڑا نظر آتا ہے جہاں دونوں اپنے آپ کو لا کر جمع کر سکتے ہیں اور ملّت کی ساری طاقت یک جہتی سے تعمیرِ نو میں لگ سکتی ہے۔

اقبال اس وسطی مقام پر کھڑے ہو کر ایک فکری تحریک کر کے رخصت ہو گیا۔ بعد میں ٹھیک وہی موقف ہے جسے عملی تحریک کے میدان میں جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ ورنہ اگر معاملہ مسٹر اور ملّا کی طبقاتی کشمکش تک رہ گیا ہوتا تو اس سے پہلے دونوں طرح کی جماعتیں اور ادارات موجود تھے، تاریخ میں کوئی خلاء نہ تھا۔ کسی جماعت اور تحریک کے لیے اگر خلاء تھا تو اسی ضرورت کے لیے تھا کہ دونوں قسم کے متصادم رجحانات کے درمیان کوئی طاقت اقبال کا نشان زدکردہ مقامِ اعتدال سنبھال کے کھڑی ہو۔ چنانچہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی ایک طرف جدید علوم میں آگے بڑھنے، جدید ادارات سے استفادہ کرنے اور جدید ذرائع و وسائل کو کام میں لانے اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے اور ان کا لحاظ رکھنے کا مسلک اختیار کیے ہوئے ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ تعمیرِ نو اسلامی فکر و اصول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اساس پر ہو۔ پس درحقیقت جماعت اسلامی ایک تاریخی تقاضے کا ظہور ہے اور یہ تاریخی تقاضا اتنا ملّت گیر ہے کہ ہر ملک میں یہ کسی نہ کسی تحریک کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ اتنی بات البتہ درست ہے کہ یہ ہمہ گیر تاریخی تقاضا رائے عام کی پوری تائید اپنے ساتھ لے کر جس بھی شکل میں جہاں نمودار ہو رہا ہے، حکمراں کلاس بہت برافروختہ ہو کر اس سے لڑ رہی ہے یعنی معاملہ مسٹر اور ملا کی کشمکش کا نہیں، بلکہ عوامی رجحانات اور حکمراں کلاس کی کشمکش کا ہے۔ کاش کہ اگر یہ طبقہ کشمکش کا راستہ اختیار نہ کرے تو تعاون کے لیے خطِ اعتدال سامنے موجود ہے۔

ایک متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی

اس سلسلے میں فاضل مدیر نے ایک "متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی" دینے پر اعتراض کیا ہے موصوف کی رائے یہ ہے کہ بس لوگ قرآن پڑھیں اور جدید علوم کے حصول میں لگ جائیں، جوں جوں افراد کے خیالات بنیں گے، ریاست اور معاشرہ ان کے ذریعے خود بخود اپنے آپ کو کسی شکل میں تعمیر کرتا جائے گا۔ اس سلسلۂ کلام میں آپ فرماتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ آنے والی نسلوں کو نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جائیں اگر آپ ان بیڑیوں میں آئندہ نسلوں کو جکڑ جانے کا حق نہیں رکھتے تو آخر نام نہاد غیر اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جانے کا حق کہاں سے حاصل ہو جاتا ہے! پھر تو چاہیے کہ آپ معاملہ بالکل ہوا میں معلّق چھوڑ دیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آئندہ نسلوں کے نام پر موجودہ نسلوں کو ان قوانین سے محروم رکھنا برحق ہو گا جس پر وہ ایمان رکھتی ہیں اور جن کو فلاح و بہبود کا ضامن سمجھتی ہیں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں موجودہ نسلیں ان پر ایمان نہیں رکھتیں۔ لیکن اس اختلافِ رائے کا فیصلہ کون کرے گا؟ — اگر دینی عوام فیصلہ کرنے والے ہیں جن کو آپ آخری اتھارٹی قرار دیتے ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ براہِ کرم اپنا یہی فقرہ، بلکہ اپنے یہ الفاظ "نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیاں" قوم کے سامنے پیش کر کے استصواب کر لیجیے کہ کتنے افراد اس طرح کے ایسے پائے جاتے ہیں جو اس طرز پر سوچتے ہیں اور یہ الفاظ اسلامی قوانین کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان الفاظ میں جو ذہن بول رہا ہے، عوام کے کتنے ووٹ اس ذہن کے حق میں پڑیں گے۔ لیکن آپ کی توجہ ان الفاظ کو لکھتے وقت عوام کی طرف کبھی نہیں ہو سکی۔ آپ نے تو اپنی طرف سے ایک قطعی فیصلہ دے دیا ہے اور انداز ایسا ہے کہ اسے زبردستی ملک بھر پر ٹھونسنا چاہتے ہیں

"متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی" کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک کوئی بات محض خطابت و صحافت کے میدان میں کی جاتی رہتی ہے، قطعیت اور تعین کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن جب معاملہ دستور بنانے، تعمیرِ معاشرہ کا خاکہ تیار کرنے اور ایک سیاسی نظام برپا کرنے کا ہوتا ہے تو ڈھیلی ڈھالی باتوں کو قطعیت اور تعین کی طرف لانا پڑتا ہے۔ اگر کوئی صاحبِ فکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و دعوت خود تعین کی طرف نہ جانا چاہیے اور محض اصولی گفتگو تک اپنے آپ کو محدود رکھے تو مخاطب خود تعین کا تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً یہی صورت عملاً جماعت اسلامی کو پیش آئی۔ اس نے کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جانا چاہیے۔ اس پر سوال ہوا کہ تفصیل سے بتائیے کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ ادھر سے کہا گیا کہ دستور کو اسلامی بنیادوں پر بننا چاہیے۔ دریافت کیا گیا کہ وہ اسلامی بنیادیں کیا ہوتی ہیں۔ چاہا گیا کہ معاشی مفاسد کی اصلاح اسلامی نظریات کے مطابق کی جائے۔ اس پر پوچھا جانے لگا کہ وہ اسلامی نظریات کیا ہیں اور ان سے معاشی مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں۔ پھر جب دعوت دی گئی کہ سود کو حرام ہونا چاہیے تو جرح ہوئی کہ اس کے بغیر بنکنگ سسٹم کے لیے کیا نقشہ دیتے ہو۔ اسی طرح کرید اور تفحص اور کثرتِ سوال نے آہستہ آہستہ پھیلے ہوئے نظریات کو تعین تک پہنچایا ہے اور یہ بالکل فطری صورت دورِ تعمیر میں دنیا کے ہر گوشے اور زمانے میں پیش آئی ہے۔ خود ہی آپ لوگوں نے پہلے اس تعین کے لیے ہر معاملے میں اصرار کیا اور اب خود ہی طعنہ دیتے ہیں کہ ہمیں کوئی متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی نہیں چاہیے۔ ہم تو گول مول باتیں پسند کرتے ہیں۔ گول مول باتوں سے تعمیر نہیں ہوتی۔ ایک متعین رہنمائی آپ کو پسند نہیں آئی تو آپ کوئی دوسری متعین رہنمائی بہم پہنچائیں اور پھر فیصلہ عوام پر چھوڑ دیں۔ خود کوئی متعین چیز دے نہیں سکتے اور دوسروں سے لینے پر تیار نہیں۔ اس پیچیدگی کا حل کیا ہے

(۴)

اداریے پر تبصرہ ہو چکا، لیکن آخر میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سلہری صاحب کے چھیڑے ہوئے مسائل کی گہرائی میں اتر کر اصل قابلِ حل مسئلہ کو سامنے لائیں۔ سلہری صاحب اپنے اداریے میں اس وسیع موضوعِ فکر کو صرف باہر ہی باہر سے مس کر سکے ہیں لیکن اس کے اندر اتر نہیں سکے، کیونکہ درحقیقت ان کی تمام تر توجہ ہمارے اہم ترین تاریخی و ملّی پرابلم سے پیدا ہونے والی سطحی بحثوں پر مرتکز رہ گئی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس بھاری پرابلم پر نگاہ ڈال کر اسے سمجھ سکے ہوں۔

ملتِ اسلامیہ پچھلے دو تین قرنوں سے غلامی کے خلاف جدوجہد کرتی ہوئی کرہ ارضی کے ہر گوشے میں آزادی سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ آزادی کا آفتاب جب کسی سرزمین پر چمک اٹھتا ہے تو احساسات جاگ اٹھتے ہیں، ولولے کروٹیں لیتے ہیں، عزائم ابھرنے لگتے ہیں اور جو کچھ فکر و شعور پیچھے سے بند چلا آیا ہو وہ زندگی کی باگ ڈور تھامنے کے لیے میدان میں آجاتا ہے۔ پاکستان بھی آزادی کی صبح سے دوچار ہے۔ قدرتی طور پر اجتماعی زندگی حرکت اور اقدام اور نشو و نما چاہتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے کہ جب پیدا ہو جاتی ہے تو حالات کی رَو کو اس جگہ روک کر نہیں رکھا جا سکتا جہاں وہ پہلے سے یخ بستہ ہو کر کھڑی تھی۔ صبح کی شعاعوں کی گرمی نے برف کو پگھلا کر سیال بنا دیا ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر سیال چیز بہنا چاہتی ہے۔ آزادی نے ارادوں کو جگا دیا ہے اور ہر جاگتا ہوا ارادہ اقدام کرنا چاہتا ہے۔ جس حالت میں ہم آج کھڑے ہیں اس پر کسی ایک فرد کے اندر بھی اطمینان باقی نہیں رہا۔ قوم کا اجتماعی ذہن تبدیلی چاہتا ہے۔ تاریخ کو ہم جکڑ بند کر کے موجودہ مقام پر کھڑا نہیں رکھ سکتے۔

لیکن اسے کس رُخ پر آگے بڑھنے کا راستہ بنا کے دیا جائے؟

سب سے پہلے مغربی فکر و تمدن کی کشش ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ چاہتے ہیں اور شاید خیر خواہی ہی کے جذبے سے چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کو قدم بہ قدم اقوام مغرب کے پیچھے سیدھے مادہ پرستانہ فکر و تمدن کی راہ پر بڑھ جانا چاہیے۔ یہی راہِ ترقی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ محض چند افراد ۔۔ ذہین سے ذہین اور خیر اندیش سے خیر اندیش افراد ۔۔ کا چاہنا اس معاملے میں فیصلہ کن نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی شعور و ارادہ تاریخی عوامل کے زیرِ اثر کیا میلانات اختیار کر چکا ہے۔ اس لحاظ سے حالات پر کوئی رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کی سطح پر پیرتے رہنے کے بجائے اس کی گہرائیوں کی غواصی کی جائے اور حکیمانہ غیر جانبداری سے کھوج لگایا جائے کہ اس سمندر کی تہہ میں کیا ہے جو اچھلنا چاہتا ہے۔

چند تاریخی حقیقتیں اس عظیم مسئلے کی تحقیق کے لیے اندر اتر یئے تو چند اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

ایک یہ کہ ہماری قوم مجموعی حیثیت سے اپنے مسلم ہونے کا احساس رکھتی ہے اور گہرا احساس رکھتی ہے۔ یہ احساس سخت درجے کے ناسازگار حالات میں بھی مٹ نہیں سکا بلکہ اس کی دور تک اتری ہوئی جڑیں برابر غذا حاصل کرتی رہی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جہاں بلحاظ ایمان و عقیدہ اسلام کا پیرو اور علمبردار ہونے کا یہ احساس مرا نہیں ہے، وہاں دوسری طرف یہ شعور بھی افراد اور معاشرہ کے اجتماعی ذہن میں موجود ہے کہ ہماری عملی زندگی اور ہمارا اجتماعی نظام اسلامی بہ حال نہیں ہے۔ فراری ذوق نے اس شعور سے بچنے کے لیے ہزار پناہ گاہیں گذشتہ صدیوں میں تعمیر کیں، لیکن اس شعور کے حملے کی زد سے بچنا ممکن نہیں ہو سکا۔ اس شعور کو زندہ رکھنے میں قرآن و حدیث کے مطالعہ نے اصل پارٹ ادا کیا ہے۔

اس کے ساتھ مسلمان چونکہ اسلامی نظام کے دورِ سعادت کی زریں تاریخ کا ایک ایک باب نہایت محفوظ شکل میں سینوں سے لگائے چلائے آرہے ہیں اور یہ تاریخ جو ان کے لٹریچر، ان کے ادب، ان کی صحافت، ان کی خطابت میں پوری طرح رچی بسی ہوئی ہے، زندگی کے ایک ایک پہلو کے بارے میں ۔۔ ان کو بول بول کے کہتی ہے کہ یہاں فلاں فلاں انحراف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کارفرما ہے۔

تیسرے یہ کہ اس قوم کا یہ احساس و شعور محض زینتِ دماغ نہیں بنا رہا بلکہ اس نے بار بار ذوقِ تغیر اس کے اندر پیدا کیا ہے اور اس ذوقِ تغیر نے یکے بعد دیگرے تجدید و احیائے اسلام کی تحریکیں اس کے دائرے میں برپا کردی ہیں۔ ان تحریکوں کا یہ نتیجہ بہرحال نکلا ہے کہ ذوقِ تغیر کی یہ لہر ہمیشہ موجود رہی ہے اور اپنا تاریخی اثر رکھتی ہے۔

چوتھے یہ کہ یہ مسلمان ہونے کا احساس اور عملاً اسلام سے ہٹے ہونے کا چھپا ہوا شعور ایسی موثر طاقتیں ہیں کہ مسلمان ان کے بل پر ایک ایک ملک میں امپیریلزم اور سامراج کے خلاف لمبی لڑائیاں لڑتے ہیں اور لڑ رہے ہیں۔ جب بھی وہ متحد ہوئے ہیں، جب بھی متحرک ہوئے ہیں اور جب کبھی انہوں نے قربانیاں دی ہیں اسلامی آئیڈیالوجی کی محبت میں دی ہیں۔ بار بار کے تجربوں نے ان پر ثابت کر دیا ہے کہ یہی ان کی زندگی، ترقی اور سرگرمی کا اصل سرچشمہ ہے۔ پھر چونکہ آزادی کو انہوں نے فی نفسہٖ نصب العین بنا کر کبھی بھی کام نہیں کیا بلکہ کھوئی ہوئی اسلامی زندگی کو پالینے کی تمنا میں آزادی کو ایک ذریعہ و وسیلہ کی حیثیت سے چاہا ہے اس لیے ہر جگہ تعمیرِ نو کے لیے سب کی نگاہیں اسی آئیڈیالوجی پر مرتکز ہیں۔

پانچویں یہ کہ مغربی فکر و تمدن کے تسلط نے دوسری ایشیائی قوموں کا ذہن جس طرح اپنے سانچے میں کامیابی سے ڈھال لیا ہے اور ان میں مادہ پرستانہ قومی سیکولر نظاموں کے لیے ایک واضح میلان پیدا کر دیا ہے، مسلمانوں پر اسے ویسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اگرچہ مسلمان معاشروں پر اس کے گہرے اثرات پڑے ہیں اور چھوٹا موٹا ایک نہ ایک طبقہ ان میں مغربی اثرات کے سامنے بڑی حد تک مفتوح ضرور ہوا ہے، لیکن اسلامی آئیڈیالوجی کی ڈھال لے کر قوم کے اجتماعی ذہن و فکر نے اپنے آپ کو مغربی فکر و تمدن کے حملوں سے بچا لیا ہے۔ مسلمانوں میں مرعوبیت اور تقلید کا ایک حد تک پرتو ضرور پڑا ہے لیکن پوری طرح ہتھیار ڈالنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ مخالفِ اسلام اثرات کے خلاف برابر لڑ رہے ہیں اور یہ لڑائی جاری ہے۔

چھٹے یہ کہ مغربی فکر و تمدن کا تجربہ اب اس حد تک مکمل ہو چکا ہے کہ اس کے کمزور اور فاسد پہلوؤں کے نتائج اور بہت ہی تلخ اور تباہ کن نتائج ---- ابھر ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ ان نتائج کی تلخی اور تباہ کاری کو خود اہلِ مغرب محسوس کر رہے ہیں اور نت نئی پیچیدگیوں کے پیش آنے پر وہاں کے اربابِ علم و حکمت خود پریشان ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حالات نے مسلمانوں کو بروقت متنبہ کر دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہیں وہ تاریخی حقیقتیں جن کے ہمہ گیر اثرات نے ہمارے اجتماعی ذہن میں اسلامی فکر اور اسلامی نظریے کو پوری مضبوطی سے جما دیا ہے۔ یہ قوم کہیں بھی ہو، نہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کر سکتی ہے، نہ وطنی قومیت کو دل میں جگہ دے سکتی ہے نہ سیکولرازم کو قبول کرنے پر تیار ہو سکتی ہے، نہ مغربی فکر و تمدن کی اندھی تقلید کر سکتی ہے، نہ کمیونزم کو جاذب کر سکتی ہے اور نہ موجودہ حالت پر نخ بستہ ہو کے پڑی رہ سکتی ہے۔ یہ قطعی طور پر اسلامی نظام زندگی ہی کی جانب رُخ کر کے نیا سفرِ حیات شروع کر سکتی ہے۔ یہ صورتِ حال کسی ایک ملک کے لیے خاص نہیں، کرۂ ارضی کی تمام مسلمان آبادی اسی تاریخی کیفیت سے گذر رہی ہے۔ اسی تاریخی کیفیت نے ہر جگہ اسلامی تحریکیں برپا کر دی ہیں۔

تضاد اور کشمکش

سوال یہ ہے کہ پھر یہ حرکت کیوں نہیں شروع ہوتی، اس میں رکاوٹ کیا ہے؟ رکاوٹ صرف یہ ہے کہ ہر جگہ قیادت کی باگ ڈور پہلے سے ایسے ایک طبقے کے ہاتھ میں ہے جو کچھ تو اپنے مناصب اور مفاد کی خاطر اور کچھ اپنے مغرب سے قبول کردہ جدید نظریات کے زیرِ اثر اجتماعی ذہن کے تاریخی رجحانات کا ساتھ نہیں دے رہا۔ یہ طبقہ عوامی میلانات کو اپنی خواہش کے تحت لے کے چلنا چاہتا ہے، اور چونکہ وہ اس سمت نہیں چلتے، لہٰذا ان کو کسی دوسری طرف بڑھنے سے روک رکھنا چاہتا ہے اسے بڑی غلط فہمی ہے کہ کبھی یہ اس کیفیت کو کسی فرد کی شرارت قرار دیتا ہے، کبھی سمجھتا ہے کہ یہ چند ملاؤں کا فتنہ ہے اور کبھی رائے قائم کرتا ہے کہ یہ فلاں دینی تنظیم کا اٹھایا ہوا طوفانِ فساد ہے۔ حالانکہ ایسے موثر تاریخی عوامل جب کام کرنے لگتے ہیں تو افراد اور تنظیموں کا پارٹ بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ان عوامل کے لیے ظاہری ذریعۂ اظہار اور وسیلۂ کار بنتے ہیں۔ اس غلط جائزہ کی وجہ سے وہ عجیب و غریب تضاد اور وہ دلچسپ کشمکش نمودار ہوئی ہے جس میں ایک طرف ہماری ہزار سالہ تاریخ فریق بن کام کر رہی ہے اور دوسری طرف ایک مختصر سا طبقہ اس کے سامنے مدافعانہ پوزیشن لیے ہوئے ہے۔

یہ ہے وہ تاریخی تضاد (HISTORICAL CONBLICT) جو اصل عظیم مسئلہ ہے اور فوری طور پر قابلِ حل مسئلہ ہے۔ یہ وہ توجہ طلب صورتِ واقعہ ہے جس پر ہمارے اونچے دماغوں کو فکر و کاوش کی ساری توانیں صرف کر دینی چاہئیں۔ مصر میں اخوان کو پھانسی چڑھا دینے اور پاکستان میں جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دینے سے یہ گرہ بہرحال نہیں سلجھ سکتی۔ کسی کے پاس کوئی ایسا آمرانہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اس تاریخی تضاد و کشمکش کو تختہ دار پر لٹکا سکے اور کسی کے ہاتھ میں کوئی ایسی پاور نہیں ہے کہ اس عظیم مسئلے کو خلافِ قانون قرار دے سکے۔ ہم سلہری صاحب سے بھی اور دوسرے تمام سوچنے سمجھنے والے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرات سے بھی درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ اس اصل گتھی کو سلجھا دیجئے۔

دوحل | یہ لاینحل نہیں ہے، بس صرف توجہ کی دیر ہے اگر ہمارے ذہین لوگ کشمکش کے سطحی مظاہر سے نیچے اتر کر اصل وجہ کشمکش سے نجات پانے کی فکر کریں تو نہ کسی اخوان المسلمون سے پھر کوئی خطرہ رہ جاتا ہے، نہ کسی جماعت اسلامی کے وجود پر اضطراب!

اس کا ایک حل یہ ہے کہ کسی تدبیر سے مسلمان قوم کو مسلمان ہونے کے احساس اور اسلامی زندگی کے شعور اور اس تک پہنچنے کی تمنا سے خالی کر دیجیے۔ اس کے بعد جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ ہو جائے گا اور کوئی خرخشہ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ خصوصاً جب تک قرآن موجود ہے، جب تک حدیث اور سنت کا ریکارڈ محفوظ ہے، جب تک دورِ سعادت کی تاریخ قوم کے حافظے پر ثبت ہے، جب تک اسلام کی روایات اور قدریں ہمارے لٹریچر، ہماری صحافت اور ہماری خطابت میں رچی بسی ہیں یہ قطعاً ناممکن ہے! اسے اگر سطحی نظر کے ساتھ آپ ممکن تصور کریں اور جبر و قوت سے قومی مزاج بدلنے کی کوشش شروع کر دیں تو ایک تو مسلمان قوم کے اپنے ہی خون سے آپ کو ہاتھ رنگنے ہوں گے، اسلامی رجحانات کو نہایت سخت گیرانہ طریق سے مسلسل دبانا ہو گا، اور چونکہ یہ بالکل مر نہیں سکتے اس لیے ہمیشہ ان کے درپے رہنا ہو گا، اپنی قوم سے معاملات کو سالہاسال کے لیے بگاڑنا ہو گا اور اس طرح کی لمبی کشمکش میں عمریں گذارنے کے لیے جمہوری فضا کو ختم کرنا ہو گا۔

اب سوچیئے کہ اس مہلک اور تباہ کن حل کو اختیار کرنے کے دور رس نتائج کیا نکلیں گے؟ ملکی حالات مصر و ایران کے معیار پر جا گریں گے اور بین الاقوامی لحاظ سے قومی وقار ختم ہو جائے گا۔ قوم کے ولولے بجھ کے رہ جائیں گے اور اس کی طاقتوں کو کسی بڑی تعمیری مہم میں استعمال نہ کیا جا سکے گا۔ آگے چل کے جب مزید ردِ عمل پیدا ہوں گے تو کمیونزم جیسے فتنوں کو آئیڈیالوجی کے خلا کی وجہ سے حملہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت بچاؤ کرنے والی کوئی فکری طاقت موجود نہ ہو گی۔ علاوہ بریں بین الاقوامی توڑ پھوڑ کے ہنگامے میں اگر خدا نخواستہ کوئی بڑا حادثہ قوم کو پیش آ گیا تو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی مؤثر ذہنی و اخلاقی سامانِ دفاع بہم نہ پہنچ سکے گا۔ بیسیوں سال اسی حالتِ تعطل میں گذر جائیں گے اور قوم پستی سے نہ نکل سکے گی۔ لیکن بیسیوں سال کے بعد بھی جب آپ جائزہ لیں گے تو معلوم ہو گا کہ "اسلامی رجحان" اب تک بھی مرا نہیں ہے بلکہ وہ خطرہ بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے۔ جیسے کہ ترکیہ میں تیس پینتیس سال کا عرصہ اسلامی رجحان کے خلاف حکمراں طاقت نے معرکہ آرائی میں صرف کر دیا اور آج بھی وہاں حال یہ ہے کہ یہ رجحان بدستور کام کر رہا ہے اور اسے کچلنے کے لیے برابر قوم کا سرمایۂ قوت برباد کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتا رہتا ہے۔ ذرا اگر جمہوریت کی فضا پیدا ہو جائے تو فوراً یہ ایک مضبوط تحریک کی شکل اختیار کر جائے گا۔ سوچیے کہ قومی قوتوں کو اس بے جا کشمکش میں جھونکتے رہنے کا حاصل کیا ہوا؟

دوسرا حل یہ ہے کہ حکمراں طبقہ ذرا سی لچک اپنے اندر پیدا کر لے اور نظریاتی ضد چھوڑ دے۔ وہ یہ حقیقت تسلیم کر لے کہ قوم میں اسلامی نظامِ زندگی کے لیے عوامی تقاضا کارفرما ہے۔ وہ اس تقاضے کو لوحِ تاریخ پر باریک نظر سے پڑھے اور اسے قبول کر لے۔ بس فکر و نظر کی ذرا سی یہ تبدیلی اور عدمِ ضد کے جذبات کی معمولی سی یہ قربانی صورتِ حالات کا پورا نقشہ بدل کے رکھ سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا حل ہے کہ جو تاریخی تضاد و کشمکش کا خاتمہ کر کے ملت کی تمام طاقتوں کو ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ اس حل کو اختیار کرنے سے قوم کو آئیڈیالوجی کی قوتِ محرکہ مل جاتی ہے، اسے ایک بنائے اتحاد ہاتھ آتی ہے، اسے ترقی کرنے کے لیے ایک رہنما قوت بہم پہنچ جاتی ہے، اور وہ دنیا کی عظیم قوموں کی صف میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔ اس حل کو قبول کر لینے سے ہمیں وہ ہتھیار مل جاتا ہے جس سے کمیونزم اور دوسرے باطل نظریات کے حملوں کو روکا جا سکتا ہے[1]۔ اس صورت میں ہم ایک ایسی طاقت سے مالامال ہو جاتے ہیں جو ہمیں بین الاقوامی حادثات کے طوفان میں چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

ہم سلہری صاحب اور اپنے اکابر اور اس طبقے کے تمام ذہین لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس حل پر غور کریں۔ آخر کیوں یہ بات بالکل ناممکن قرار دے دی گئی ہے کہ ملت پر اثر انداز ہونے والے تاریخی تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جا سکتا اور کیوں یہ ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلامی تحریکوں کا خون بہا کر ہی آگے چلا جا سکتا ہے۔ جو ناکام اور احمقانہ حل ناصری آمریت[2] نے اختیار کیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے اکابر بھی اسی کو قابلِ تقلید مثال بنائیں؟

---

[1] چنانچہ زیرِ تدوین دستور سے لوگوں کو یہی امیدیں تھیں کہ اس کے نفاذ سے ہم مذکورہ بالا تاریخی تضاد و کشمکش سے نجات پا کر ایک متحدہ طاقت کی حیثیت سے کام کر سکیں گے۔

[2] غور فرمائیے کہ بنو امیہ کے عہد سے لے کر آج تک ذرا سی راج ہٹ کے لیے امت کے بہترین عناصر کا کتنا خون بہایا گیا ہے اور اس دور میں بھی ترکیہ اور مصر میں ملتِ اسلامیہ کی جس فعال طاقت کو دریا برد کیا گیا اور کیا جا رہا ہے، پھر خود پاکستان میں بھی عدمِ تعاون ہی نہیں تشدد کر کر کے دینی طاقتوں کو جتنا کمزور کیا جا رہا ہے، اگر اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کی یہ مہم اس طرح جاری نہ رکھی جاتی تو ہماری قوتِ تعمیر کتنی بڑی ہوتی اور ہم اپنے موجودہ مقام سے کتنے آگے ہوتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی نہیں کہتا کہ جدید حالات اور تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے چلیئے، کسی میں یہ انتہا پسندی کارفرما نہیں ہے کہ پورے کا پورا اسلام آناً فاناً یہاں سے وہاں تک چھا جائے، بلکہ سب لوگ تدریج کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ وہی تن تنہا سب کچھ (ALL IN ALL) ہو، کسی کو موجودہ حکمرانوں سے کوئی چڑ اور کد نہیں ہے کہ ان کو ضرور ان کے مناصب سے ہٹانا ہے اور اسلام کا نام اسی کد کو پورا کرنے کے لیے نقابِ فریب کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ آپ لوگ دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور قومی عناصر اور طاقتوں کو باہم دگر پھاڑیئے نہیں بلکہ زبان و قلم سے ان کو قریب تر کرنے کی فکر کیجیے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسلام کو کسی درجے میں اپنایئے اور خلوص سے اپنایئے اور پھر تھوڑا یا بہت عملی کام کر کے دکھایئے۔ جس دن آپ نے تبدیلی کا ثبوت ہمارے اکابر نے دے دیا اُس دن بالکل نئے جذبات اور نئے حالات کے سرچشمے پھوٹ پڑیں گے۔ جو شخص اس صف میں سب سے پہلے آگے بڑھ کر یہ تجربہ کرے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ اس کے کتنے اچھے نتائج سامنے آتے ہیں اور کتنی بڑی قبولیتِ عامہ اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ سلہری صاحب سے درخواست ہے کہ وہ اوپر کی بحث سے اگر کوئی ناگوار اثر بھی لیں تو اسے اس موقع پر ذہن سے الگ کر کے ان نقاطِ فکر کے مطابق بھی ذرا غور فرمائیں۔ پہلے حل اور دوسرے حل کے نتائج کے فرق کا جائزہ لیں۔ پھر اپنے ہی سامنے یہ سوال رکھیں کہ کیا یہ دوسری صورت بالکل ناممکن ہے؟

سلاجقہ

(سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)

دولتِ عباسیہ کے سیاسی زوال کے بعد جس سلطنت نے ممالک اسلامیہ کے بیشتر حصّہ کو ایک مرکز پر جمع کیا اور مسلمانوں کو سیاسی انتشار اور پراگندگی سے نکال کر دنیا کے سامنے عالمِ انسانی کا رہنما اور امام بنا کر آخری مرتبہ پیش کیا وہ سلجوقی سلطنت تھی اس کے کارنامے مولانا کی اس تاریخی کتاب میں ملاحظہ کیجیے۔ قیمت : ۳/۸

طاہر رسول قادری، سول ایجنٹ، ۸۱ پیر غازی روڈ، اچھرہ، لاہور

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی (پاکستان) اور اپنے شہر کے کتب فروشوں سے حاصل فرمائیں

© rasailojaraid.com